محمد علی جوہر

از

خواجہ احمد عباس

منصور حیدر راجہ
ناشران
حالی پبلشنگ ہاؤس
کتاب گھر دہلی

از

خواجہ احمد عباس

ناشران

حالی پبلشنگ ہاؤس

"کتاب گھر" دہلی

"مادرِ ہند سپوت سیریز" (رجسٹرڈ) نمبر ۱

مختصر سوانح حیات

شہیدِ ملّت رئیس الاحرار مولانا محمّد علی مرحوم

از

خواجہ احمد عباس

ناشران

حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر"

دہلی

(کتبہ جو کا) قیمت ۶/

(مطبوعہ جیّد برقی پریس دہلی)

اپنے والد کے نام

کہ اُنھوں نے نہ صرف مجھے مولٰینا
محمد علی مرحوم کی ذات سے بلکہ ان کی
صفات سے بھی روشناس کرایا +

بمبئی
۲۲ مارچ ۳۶ء

احمد عباس

دیباچہ

دنیا کی جتنی زندہ قومیں ہیں ان میں قومی رہنماؤں اور ملک کے خادموں کی یاد مختلف طریقوں سے تازہ رکھی جاتی ہے، اُن کے مجسمے نصب کئے جاتے ہیں، اُن کے ناموں سے منسوب ادارے قائم کئے جاتے ہیں، اُن کی پیدائش یا موت کے دنوں کو سالانہ منایا جاتا ہے، اُن کی سوانح عمریاں شائع کی جاتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرالذکر طریقہ ہی سب سے بہتر ہے کیونکہ اپنے قومی بزرگوں کی زندگی کے حالات، اُن کے کارناموں اور قربانیوں سے عوام کو روشناس کرانا نہ صرف اُن کی یاد کو تازہ کرنا ہے بلکہ اپنے ملک کی ایک بڑی خدمت ہے۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کی زندگی اپنے اندر ہمارے لئے زبردست سبق رکھتی ہے اور اس کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک مشعل کا کام دے اور اُن کو بھی اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی ترغیب ہو۔

تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہندوستان کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ہمارے عوام اپنے ملک کی بڑی ہستیوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ مگر اس سے زیادہ افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی اپنے قومی رہنماؤں کے حالات زندگی سے بے خبر ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک عوام کے لئے ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جو آسان زبان اور عام فہم انداز میں ہمارے سیاسی لیڈروں، مصلحوں، عالموں، شاعروں ادیبوں اور دوسرے زبردست ہندوستانیوں کی سوانح حیات پیش کریں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کا

ایک سلسلہ "مادرِ ہند کے سپوت" کے نام سے شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بلاکسی تفریق کے ہندوستان کی تمام بڑی ہستیوں کے حالات زندگی شائع کئے جائیں گے۔

مولانا محمد علی کی یہ مختصر سوانح حیات اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ ہندوستانیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تشکیل میں مولانا مرحوم نے جو نمایاں حصہ لیا وہ محتاجِ بیاں نہیں، اُن کا عزم، اُن کا استقلال، اُن کی وطن پرستی اور قوم پروری یہ سب وہ صفات ہیں جو ہمارے نوجوانوں کے لئے ہدایت اور نمونہ ثابت ہو سکتی ہیں، اُن کی تمام زندگی قوم کی خدمت میں گزری، ہندوستان سے اُن کی محبت کبھی کم نہ ہوئی اور آخر دم تک وہ اُس کی آزادی کے لئے کوشاں رہے۔ کاش ہمارے اہلِ ملک اُن کی زندگی کو ایک روشن مثال کی طرح پیشِ نظر رکھیں۔

اسی سلسلہ میں جلد شائع ہونے والی کتابیں سر سید احمد خاں اور مہاتما گاندھی پر ہوں گی، اور ہمیں امید ہے کہ یہ قومی سلسلہ ملک میں مقبول ہوگا۔

اس کے علاوہ مشاہیرِ عالم سیریز کا انتظام بھی ہو رہا ہے جس میں سب سے پہلی کتاب مسولینی کی زندگی کے حالات ہے، جو حبشہ اور اٹلی کی جنگ کی روشنی میں لکھی گئی شائع ہو گئی ہے۔

ناشران

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

اپریل ۱۹۳۶ء
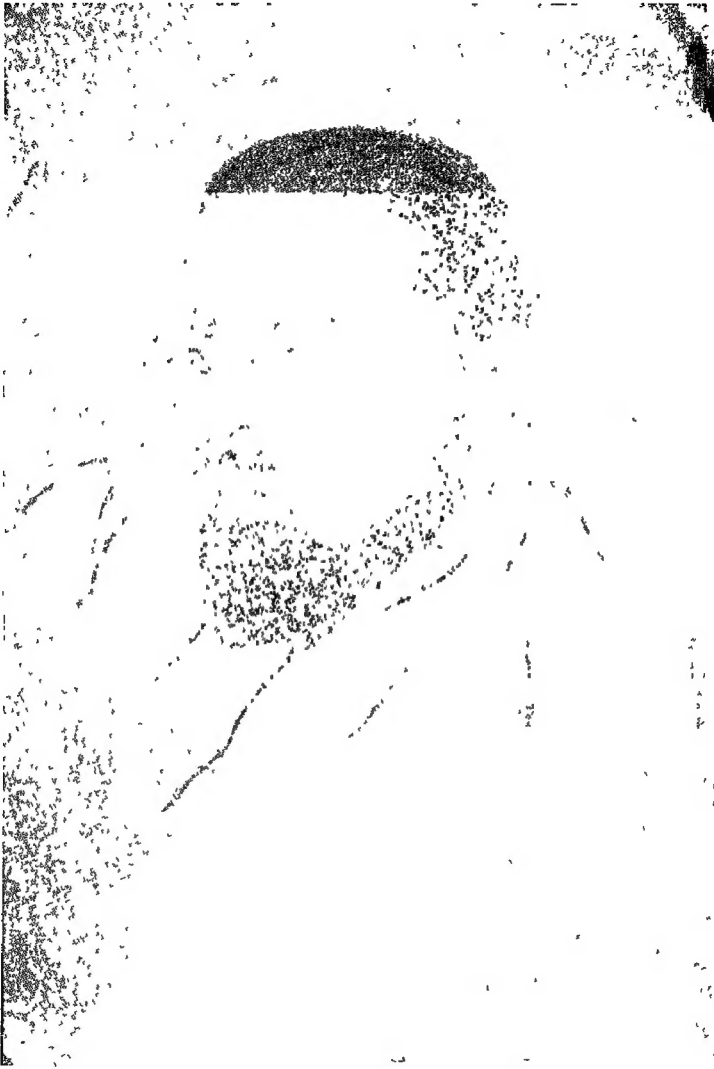
مولانا محمد علی

"میں آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے

کہ میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے

ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا

مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے

غربت کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان

کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر یہاں میرے لئے ایک

قبر کی جگہ دینی پڑے گی۔"

......گول میز کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر

محمد علی

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

محمد علی ۱۸۷۸ء کے آخر میں پیدا ہوئے، ان کے والد عبد العلی خان صاحب بجنور کے رئیس تھے، اور نواب یوسف علی خان فرمانروائے رامپور کے دربار میں ایک ممتاز منصب پر فائز تھے۔ اکثر مشاہیرِ عالم کی طرح محمد علی کے سر سے بچپن ہی میں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ اور ان کی اور ان کے دو بڑے بھائیوں شوکت علی اور ذوالفقار علی کی تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری "بی اماں" مرحومہ کو اُٹھانی پڑی۔

کلام مجید اور اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد تینوں بھائی بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے اور یہاں اس کم سنی میں محمد علی کی جودت، ذہانت، اور حاضر جوابی کا سکہ بیٹھ گیا۔ وہ کچھ ایسے محنتی نہیں تھے۔ اور درسی کتابوں کی طرف کم توجہ کرتے تھے، مگر سب اُستاد ان سے خوش رہتے تھے اور طالب علم انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ قیادت کی صلاحیت محمد علی میں ابھی سے موجود تھی، اور سکول میں وہ اپنے ہم عمروں کے مانے ہوئے لیڈر تھے۔

علی گڑھ

یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کالج نیا نیا قائم ہوا تھا۔ سرسیّد کی مخالفت کا زور کم ہوتا جاتا تھا۔ اور اکثر شرفا اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے علی گڑھ بھیج رہے تھے۔ مغربی تعلیم نے ابھی تک مسلمانوں میں رواج نہیں پایا تھا اور اسی لئے سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر بہت کم مسلمان نظر آتے تھے۔ سرسیّد کی کوششوں سے چند گھرانوں میں تعلیم کا چرچا

کچھ کچھ ہو چلا تھا کیونکہ بغیر کالج کی ڈگری کے سرکاری ملازمتوں کا دروازہ ان کیلئے
بند تھا۔ علی گڑھ میں زیادہ تر طالب علم کھاتے پیتے گھرانوں کے تھے۔ معاش
کی طرف سے اطمینان تھا کہ بی۔ اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری یا اس قسم کا کوئی
اور عہدہ مل ہی جائے گا۔ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بے فکری کی تھی،
کھیلوں میں علی گڑھ والوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، انگریزی تحریر اور تقریر
میں انہیں کمال حاصل تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن سے پہلے پہل سابقہ
پڑا تھا اس لئے طلبہ اچھا اور برا دونوں قسم کا اثر بہت تیزی سے قبول کر
رہے تھے۔

یہ فضا تھی جس میں شوکت علی اور محمد علی داخل ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں
علی گڑھ پر چھا گئے۔ کرکٹ سے دونوں بھائیوں کو شوق تھا لیکن شوکت علی نے
اس کھیل میں زیادہ ترقی کی۔ یہاں تک کہ کپتان مقرر ہو گئے۔ ادھر محمد علی
نے یونین میں تیغ زباں کے جوہر دکھائے اور فصاحت و بلاغت میں جھنڈے
گاڑ دیئے۔ سال کا بڑا حصہ محمد علی کھیل کود اور تفریحات میں گزارتے تھے۔
لیکن ان کا حافظہ اور ذہن اس بلا کا تھا کہ امتحان سے دو مہینے پہلے
محنت شروع کر کے ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے تھے۔ انگریزی
میں محمد علی کی قابلیت قابلِ رشک تھی۔ تقریر اور تحریر دونوں پر قادر تھے
یونین میں ان کی انگریزی تقریریں سن کر اکثر انگریز پروفیسر دنگ رہ جاتے
تھے مگر اس آزادی رائے کے باعث جو ہمیشہ محمد علی کا طرۂ امتیاز رہی،
ان سے اکثر اساتذہ سے اختلاف ہوا۔ وہ ابتدا ہی سے پرجوش اور

دلیرانہ تقریریں کرنے میں مشہور تھے۔

غرض ۱۸۹۶ء میں بیس سال کی عمر میں محمد علی نے بی۔ اے۔ کا امتحان دیا۔ انہیں اپنے پاس ہونے کی امید ضرور تھی اور جو لوگ محمد علی سے واقف تھے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہونگے۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو سب یہ دیکھکر حیرت میں رہ گئے کہ علی گڑھ کا یہ کھلنڈرا جس نے وقت کا بیشتر حصہ یونین کے پلیٹ فارم اور کرکٹ کے میدان پر گزارا تھا تمام صوبے کے کامیاب طلبا میں اول رہا۔

آکسفورڈ علی گڑھ کی زندگی ختم کرنے کے بعد محمد علی عازم انگلستان ہوئے دوستوں نے افسوس کے ساتھ اپنے رفیق اور سردار کو رخصت کیا اور محمد علی "لیلائے سول سروس" کی تمنا میں ولایت روانہ ہوگئے۔ وہ لنکن کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے اور سول سروس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اس طوقِ غلامی کو اپنی گردن میں لٹکائیں۔ اصل میں محمد علی کی علم دوست اور ادب آشنا طبیعت کو اس سے کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ قیام آکسفورڈ کے زمانے میں انہوں نے صرف موافق طبع مضامین کا مطالعہ کیا اور دوسرے مضامین کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ نتیجہ ظاہر ہے جو ہوا ہوگا۔ شوکت علی نے جس وقت ہندوستان میں چھوٹے بھائی کی ناکامی کی خبر پڑھی تو انہیں سخت رنج ہوا۔ اور محمد علی ولایت سے واپس بلا لئے گئے۔ مگر بی اماں کا حوصلہ دیکھئے کہ انہوں نے اس ناکامی کا کوئی اثر اپنے اوپر ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ جب محمد علی آئے تو ان

کی دلدہی اور ہمت افزائی کی۔ اسی سال محمد علی کی شادی ہوگئی اور وہ دوبارہ ولایت بھیجے گئے کہ انگریزی ادب میں بی۔اے کریں۔ چونکہ ادب سے طبیعت کو شروع ہی سے لگاؤ تھا اس لئے اُنہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ آنرز کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان واپس چلے آئے۔ قیامِ ولایت میں محمد علی نے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کرلیا۔ اُنہوں نے بہترین صحبتوں میں شرکت کی۔ سیر و تفریح، کھیل کود کا لطف اُٹھایا، مگر باوجود ہزار ہا تحریصوں کے نہایت پاکبازانہ زندگی بسر کی۔

رام پور اور بڑودہ

ولایت سے واپسی پر نواب صاحب رام پور نے انہیں رام پور ہائی سکول کا پرنسپل اور ریاست کا افسر تعلیمات بنا دیا۔ لیکن ریاست کی فضا میں جو سازشوں سے پر تھی محمد علی کا نبھنا مشکل تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے نوکری سے استعفےٰ دیدیا۔ اور شوکت صاحب کے پاس چلے گئے۔ مگر انہیں زیادہ عرصہ تک بے کار نہ رہنا پڑا۔ قیامِ ولایت کے دوران میں ان کے تعلقات بڑودہ کے ولیعہد کنور فتح سنگھ سے قائم ہو چکے تھے۔ اور کنور صاحب کی کوشش سے محمد علی ریاستِ بڑودہ میں بُلالئے گئے۔ چار سال تک انہوں نے محکمۂ افیون میں ایک اعلیٰ افسر کے فرائض انجام دئے اور اتنی مستعدی اور قابلیت سے کام کیا کہ ملازمت کے پانچویں سال ریاست کے ضلع نوساری کے کمشنر مقرر کئے گئے۔ اِس عہدے کے فرائض بھی محمد علی نے نہایت خوبی اور دیانت داری سے انجام دئے۔ انہوں نے متعدد اصلاحات نافذ کیں

خصوصاً غریبوں پر جو ظلم ہوتا تھا اس کی روک تھام کی اور چند ہی سال میں رعایا کے دلوں میں گھر کر لیا۔ کچھ عرصے کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ بھی رہے مگر کنور صاحب تھوڑے ہی دنوں بعد شراب کی بھینٹ چڑھ گئے۔

نوکری سے استعفیٰ

محمد علی کے ادبی ذوق نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا محکمۂ افیون کی افسری یا ضلع کی حکومت کے کام کے باوجود انہوں نے اپنا تحریری مشغلہ جاری رکھا۔ بڑودہ کی ملازمت سے پہلے الٰہ آباد سے "گپ" کے نام سے انگریزی میں ایک مزاحیہ پرچہ اپنے آکسفورڈ کے رفیق کنور جگدیش پرشاد (حال وزیر تعلیم حکومت ہند) کی شرکت میں نکالا تھا مگر دو پرچوں کے بعد کوئی نمبر نہ نکل سکا۔ ملازمت کے دوران میں بھی مضمون نگاری جاری تھی۔ ٹائمز آف انڈیا میں اکثر لکھتے رہتے تھے۔ اسی عرصہ میں ان کے چند مضامین مسلمانوں کے حقوق کی حمایت میں شائع ہوئے۔ ریاست کی کونسل سے جواب طلب ہوا محمد علی نے ایسا دنداں شکن جواب دیا کہ کونسل سے سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑی کہ ایک خفیہ سرکاری سرکلر کے ذریعہ ریاست کے ملازموں کو اخباروں میں سیاسی مضامین لکھنے کی ممانعت کر دے۔ محمد علی کا دل ملازمت سے کھٹا ہو گیا۔ انہوں نے پہلے رخصت لی اور پھر باوجود مہاراجہ کے اصرار کے استعفیٰ دیکر الگ ہو گئے۔

کامریڈ

اب محمد علی کو موقع ملا کہ اپنی صحافتی قابلیت کے جوہر دکھائیں کلکتہ سے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" (یعنی رفیق) نکالا

جو سال بھر ہی میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کے خریداروں میں ملک کے تمام سربرآوردہ لوگ یہاں تک کہ لیڈی ہارڈنگ اور لارڈ ہارڈنگ بھی شامل تھے۔ محمد علی انگریزی اہل زباں کی طرح لکھتے تھے اور ان کا اسلوب بیاں اتنا شستہ اور پاکیزہ ہوتا تھا کہ بڑے بڑے انگریز ان کی قابلیت کے قائل تھے۔ سلاست بیاں کے ساتھ قدرت نے بذلہ سنجی اور شگفتگی کا جوہر بھی عطا کیا تھا۔ اس لئے ہر مضمون کو اتنا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بے ختم کئے نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ یہ پرچہ ایک مدت تک بڑے اہتمام اور شان سے نکلتا رہا اور تمام ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گیا۔ آخر پریس ایکٹ کے ماتحت بند ہو گیا۔

ملک کی سیاست میں شریک ہونے کے بعد اکثر محمد علی کو اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ اخبار کی جتنی خدمت کرنی چاہیئے کرسکیں۔ مگر ان کو نائب بھی راجہ غلام حسین جیسا ملا تھا جس کی انگریزی کی قابلیت اور صحافت کے خود محمد علی قائل تھے۔ یہ اس نوجوان ہی کا کام تھا کہ محمد علی کی غیر موجودگی میں "کامریڈ" اسی شان سے نکلتا تھا۔ اور کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ محمد علی کا قلم ہے یا راجہ غلام حسین کا۔ "کامریڈ" کے مستقل مضمون نگاروں میں سید ولایت علی "بمبوق" بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مگر محمد علی کو بھی اپنے فرائض کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ کسی جلسہ وغیرہ کی شرکت کے لئے باہر جانا ہوا اور اخبار کی اشاعت کی تاریخ سر پر

آ گئی تو جہاں ہوئے رات کی نیند حرام کرکے مضمون لکھکر بھیجا۔ بلکہ کانگریس کے (۱۹۲۱ء) موقع پر تو کئی کالم کا ایک پورا افتتاحیہ تار سے بھیجا۔

مسلم لیگ

مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ قائم ہوئی محمد علی نے اس وقت تک سیاسی دنیا میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن باوجود سیاسی ناتجربہ کاری اور نو عمری کے لیگ کے نظام کی ترتیب اور قواعد و ضوابط کی درستی کا کام اسی نوجوان اخبار نویس نے کیا۔ لیگ اوّلاً اعتدال پسندوں کی ایک جماعت تھی جس کا کام بس اتنا تھا کہ سال میں ایک دفعہ جلسہ کرکے چند ریزولیوشن پاس کردے جن میں گورنمنٹ اور برادران وطن دونوں سے شکایت ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا اور نشستوں اور ملازمتوں کے لئے سرکار دولت مدار سے مؤدبانہ درخواست کی جائے۔ یہ محمد علی ہی کا کام تھا کہ اُنھوں نے لیگ کے مُردہ قالب میں جان ڈالی اور آخرکار اعلان کرادیا کہ لیگ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرے گی۔ اگرچہ اب مسلم لیگ "وفا شعاروں" کی مدد سے پھر اپنے اصلی رنگ پر آگئی ہے، مگر محمد علی کی قیادت میں اس نے مُلک کی نہایت شاندار اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

طبّی وفد

۱۹۱۳ء میں جب جنگِ بلقان شروع ہوئی ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک سخت ہیجان پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کے

مسلمان ملازمین اور موافقین نے بھی کھلم کھلا ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا۔ ملک میں اِدھر سے اُدھر تک ایک آگ لگی ہوئی تھی یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے بھی ایک پرجوش ولولہ انگیز نظم لکھی جو لکھنؤ کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے یہ تجویز کی کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد ترک مجروحین کی مدد کیلئے جائے۔ لیکن دقت سرمائے کی تھی جس کی فراہمی کا بیڑا محمد علی نے اُٹھایا۔ اسی عرصے میں سب بڑے شہروں میں ترکوں کی مدد کے لئے "ہلال احمر" کے نام سے انجمنیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان انجمنوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے چندہ جمع کر کے ترکوں کو مالی امداد بھجوائیں۔ محمد علی نے طبی وفد کی تجویز دہلی کی انجمن ہلال احمر کے سامنے پیش کی اور مسئلہ کی اہمیت کو سمجھایا۔ انجمن کے ارکین نے اس وقت پندرہ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کر لیا مگر کچھ عرصہ کے بعد رائے بدل دی اور وفد کو مالی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ محمد علی نے یہ سن کر بھی ہمت نہ ہاری بلکہ ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ روپیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر باقی انتظام مکمل کریں۔ اسی رات کو جا کر کامریڈ کے لئے ایک ایسا معرکۃ الآرا مضمون لکھا کہ اس کی اشاعت کے دوسرے ہی دن سے روپیہ کی بارش شروع ہو گئی۔ اس واقعے سے محمد علی کے قلم کی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند ہی دن میں ضرورت سے زیادہ روپیہ فراہم ہو گیا۔ اور وفد ترکی بھیجا گیا۔ جہاں ارکین وفد نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

کامریڈ سے ضمانت ترکوں کی مالی مصیبتوں کو دیکھ کر محمد علی نے

تمام ہندوستان کا دورہ کیا، اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ترکی حکومت کے تمسکات خرید کر لاکھوں روپئے سے ترکوں کی مدد کی۔
اسی زمانے میں ترکوں نے اہلِ مقدونیہ کے نام ایک دردانگیز اپیل شائع کی تھی جس کا عنوان تھا "مقدونیہ والو آؤ اور ہماری مدد کرو" محمد علی نے کمال جرأت سے کام لے کر پوری اپیل قسط وار کامریڈ میں شائع کی۔ اسکا شائع ہونا ہی تھا کہ گورنمنٹ نے کامریڈ کے تمام پرچے جس میں یہ اپیل شائع ہوئی تھی ضبط کر لئے اور دو ہزار روپئے کی ضمانت طلب کی۔ پریس ایکٹ اس زمانے میں بھی گورنمنٹ کا ایک طاقتور حربہ تھا اُن کو آزاد خیال اخباروں کے خلاف اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر کامریڈ کا اب بھی دہی دم خم تھا ۱۹۱۴ء میں جب ٹرنر مارسن کمپنی نے حجاز کی جہاز رانی کے اجارے کی تجدید کی درخواست حکومتِ ہند کے سامنے پیش کی اور محمد علی کو اسکا علم ہوا تو انھوں نے فوراً کامریڈ کا ایک ضمیمہ شائع کیا جس میں اس درخواست کے خلاف سختی سے صدائے احتجاج بلند کی۔ اس ضمیمہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ نے درخواست کو مسترد کر دیا۔ اگرچہ چند سال بعد جب محمد علی نظر بندی میں تھے پھر اسی کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا گیا۔

"ہمدرد"

اب تک محمد علی کی صحافت انگریزی تک محدود تھی مگر جب دارالسلطنت کی تبدیلی کے ساتھ کامریڈ بھی کلکتہ سے دہلی آیا تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے مشورے سے محمد علی نے ایک اُردو روزنامہ "ہمدرد" کے نام سے جاری کیا۔ ہمدرد کے ادارے

میں انہوں نے چُن چُن کردہ ادیب اور مضمون نگار رکھے جن میں سے ہر ایک
ملک کے اہلِ قلم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ میر محفوظ علی، سید ہاشمی فرید آبادی
قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالحلیم شرر، اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی
جیسے معاون ملے تو ہمدرد بھی آسمان صحافت پر اس شان سے چمکا کہ اور سب
اُردو اخبار اسکے سامنے ماند پڑ گئے۔ خبروں کی دیدہ زیب ترتیب، اعلیٰ
مضامین افتتاحیہ، علمی مقالے اور تفریحی مضامین یہ سب ہمدرد کی وہ
خصوصیات تھیں جو آج تک کم از کم کسی اُردو اخبار کو تو نصیب نہیں ہوئیں
بلکہ بعض خوبیاں ایسی بھی تھیں جو بہت کم انگریزی اخباروں میں نظر
آئیں گی۔ عام طور سے ہندوستان سے جو انگریزی یا اُردو روزنامے
نکلتے ہیں ان میں ایڈیٹر اپنے آپ کو ادارت کے دوسرے ارکان سے
بالاتر سمجھتا ہے اور اپنا فرض فقط احکام صادر کرنا جانتا ہے۔ برخلاف
اس کے محمد علی کا ادارہ ایک خاندان کی طرح تھا اور ایک وقت
معین پر تمام لوگ محمد علی کے کمرے میں اکٹھے ہو کر اگلے دن کے نمبر کے
متعلق مشورہ کرتے تھے۔ محمد علی ہر ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایات
دیتے تھے اور دوسروں کو بھی موقع دیتے تھے کہ اخبار کے بارے میں
اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ "ہمدرد" اور "کامریڈ"
کے ادارے کے لوگ اپنا کام محنت، دلچسپی اور خلوص کے ساتھ
کرتے تھے۔ اور یہی ان اخباروں کی کامیابی کا راز تھا۔
غرض "ہمدرد" نہایت شان سے نکلتا رہا۔ یہاں تک کہ محمد علی

کی نظر بندی کے بعد اس کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد "کامریڈ" اور "ہمدرد" پھر نکلے۔ مگر افسوس ہے کہ اس بار وہ پہلی سی شان نہ تھی۔ ایک تو راجہ غلام حسین کی ناگہانی موت نے "کامریڈ" کے کام کو بہت نقصان پہنچایا۔ دوسرے اب محمد علی سیاست کے اکھاڑے میں اُتر چکے تھے۔ اِن کا تمام تر وقت قومی اور ملکی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ کانگریس کی رہنمائی، خلافت کی ناخدائی، اور دوسری سیاسی مصروفیتیں اخباروں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیتی تھیں۔

ایک معرکۃ الآرا مضمون

کامریڈ کی ضمانت کی ضبطی جو اس کی بے وقت موت کا سبب تھی ایک ایسے مضمون کے سلسلہ میں ہوئی جو ہندوستان کی تاریخ صحافت میں یادگار رہیگا۔ جنگ عظیم کے آغاز پر لندن کے مشہور اخبار "ٹائمز" نے ایک افتتاحیہ میں ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دیں۔ اس مضمون کو دیکھکر محمد علی نے وہ معرکہ کا جواب لکھا کہ لندن ٹائمز کے مضمون کے چیتھڑے اُڑادیے۔ مضمون کا عنوان تھا "ترکوں کا فیصلہ" (Choice of the Turks) اور یہ کامریڈ کے بائیس کالم پر پھیلا ہوا تھا۔ باوجود اپنی بیگم صاحبہ کی علالت کے محمد علی نے چالیس گھنٹے کی مسلسل نشست میں یہ مضمون تیار کیا۔ جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتے تو اسسٹنٹ ایڈیٹر کو لکھواتے جاتے تھے۔ مضمون کیا تھا ممالک اسلامی میں برطانوی

استبداد کی ریشہ دوانیوں کی مکمل داستان تھی۔ حکومت بھلا کب گوارا کرسکتی تھی کہ ایسے مضمون کا لکھنے والا چین سے بیٹھے۔ چند ہی روز میں "ہمدرد اور کامریڈ" دونوں کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ محمد علی نے اپیل کیا اور ہائی کورٹ میں خود بحث اور جرح کی۔ تمام عدالت وکیلوں، بیرسٹروں اور تماشائیوں سے بھری ہوئی تھی اور ہر شخص ان کی ذہانت اور قانونی قابلیت کو دیکھکر حیرت کرتا تھا۔ مگر نتیجہ جو ہونا تھا ہوا ضمانت کی ضبطی کا حکم بحال رہا۔ "کامریڈ" بند ہو گیا۔ مگر اس دن سے محمد علی اور سب کاموں کو چھوڑ کر سیاست ہی کے ہو رہے۔ حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ایک زبردست حریف میدان میں اُترا ہے اور قوم نے جان لیا کہ اس کا مجاہدِ اعظم آن پہنچا ہے۔

نظر بندی

ضمانت کی ضبطی کے بعد محمد علی کی صحت بہت گر گئی اور حکیم اجمل خان مرحوم اور ڈاکٹر انصاری دونوں نے مشورہ دیا کہ ان کو دماغی محنت سے آرام لینا چاہیے۔ تبدیلِ آب و ہوا کی خواہش اور وطن کی یاد انہیں رام پور لے گئی لیکن وہاں پہنچا ہی تھا کہ صوبہ کے انسپکٹر جنرل پولیس نواب رامپور کے پاس آئے اور محمد علی کو حکم ملا کہ بغیر نواب صاحب کی اجازت کے وہ ریاست کی حدود نہیں چھوڑ سکتے۔ مگر ایک ہی دن کی نظر بندی کے بعد رہائی مل گئی۔ اس عرصے میں مولینا شوکت علی بھی رام پور آ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کا ارادہ دہلی ہوتے ہوئے اجمیر شریف کے سالانہ عرس میں جانے کا ہوا۔ دہلی آئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ ضلع کے میجسٹریٹ کا حکم ملا کہ دونوں بھائی اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں

نظربندی کی خبر سُن کر محمد علی بے حد خوش ہوئے اور اُنھوں نے بجائے
افسوس کرنے کے خدا کا شکر ادا کیا حسب الحکم پھر دلی جا کر رہے۔ یہاں
ان کو ہر طرح کی آسانیاں حاصل تھیں۔ ہمدرد کے لئے مضامین لکھ سکتے
تھے۔ دوست احباب دہلی سے ملاقات کے لئے آسکتے تھے۔ مگر حکومت کو
یہ بھی گوارا نہ تھا۔ اسلئے ان کو لینس ڈاون بھیجدیا گیا اور ان کے قلم کی آزادی
بھی سلب کرلی گئی۔

جُرم؟ محمد علی نے اپنے کبھی کے دوست مسٹر جیمس مسٹن گورنر صوبۂ متحدہ کو
خط لکھا کہ کم سے کم مجھے میرے جُرم سے تو مطلع کیا جائے۔ مگر
اس کا یہ جواب ملا کہ اس مسئلے پر گورنر صاحب زیادہ گفت و شنید نہیں کر سکتے
گورنمنٹ سے جب مجالس مقننہ میں سوالات کئے گئے تو اس نے قانونی دفعات
کے حوالے دیکر ٹال دیا۔ مگر ۱۹۱۶ء میں جب دہلی کی سالانہ سرکاری رپورٹ
شائع ہوئی تو اس میں علی برادران کے متعلق فرمایا گیا کہ "محمد علی شوکت علی
کو نظربند کرنا ضروری معلوم ہوا اسلئے کہ گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت
و تلخ کارروائیاں مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں۔" امپیریل کاؤنسل
میں جناح اور مظہر الحق صاحب نے جب گورنمنٹ سے اس نظربندی کی وجوہ
مانگیں تو جواب ملا "چونکہ ان دونوں بھائیوں نے کھلّم کھلّا گورنمنٹ کے
خلاف تحریک میں حصہ لیا اس لئے ان کو نظربند کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اور اگر
وہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہنے کا وعدہ کریں تو گورنمنٹ ان کی رہائی
کے مسئلہ پر غور کر سکتی ہے۔" مگر ایسا وعدہ کرنا معافی مانگنے کے برابر تھا اور محمد علی

جیسے غیور کے لئے معافی موت سے بدتر تھی۔

اصل وجہ ظاہر تھی۔ اس وقت تک گورنمنٹ نے سمجھ رکھا تھا کہ کم سے کم مسلمان تو ہمیشہ وفادار سرکار رہیں گے۔ مگر ان دونوں بھائیوں کی سرگرمیوں اور عام سیاسی بیداری کے اثرات سے مسلمانوں میں بھی وطن پرستی اور خودداری کا مادہ پیدا ہو چلا تھا۔ ترکوں کے خلاف تمام یورپ کی قوتوں کے اجتماع سے جس میں برطانیہ بھی شامل تھا مسلمان حکومت سے اور بھی بددل ہو گئے تھے۔ اس پر محمد علی کے مضامین خصوصاً "ترکوں کے فیصلہ" نے گورنمنٹ کی طرف سے بہت کچھ بدظنی پھیلا دی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس سارے فساد کی جڑ یہی دونوں بھائی ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں غیر متعین مدت کے لئے نظر بند کر دیے گئے۔ چونکہ ان سے کوئی خاص جرم سرزد نہیں ہوا تھا اس لئے باقاعدہ مقدمہ چلا کر قید کرنا مشکل تھا۔

غداری سے انکار

اس سلسلے میں محمد علی کے مشیر قانونی مسٹر گھاٹے کا ایک خط قابل ذکر ہے جو انہوں نے علی برادران کی نظر بندی کے متعلق مسز بیسنٹ کو لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی انگریز ہندوستانیوں سے اپنا کام نکالنے کے لئے ہر قسم کا لالچ دیتے تھے۔ مسٹر گھاٹے لکھتے ہیں کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ جب محمد علی اور سید وزیر حسن انگلستان میں تھے تو ان سے کہا گیا تھا کہ وہ "انڈو برٹش ایسوسی ایشن" میں شامل ہوں اور حکومت ہند کے اینگلو انڈین ارکان کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام کے مقابلے

میں کارروائی کریں۔ یہ تحریک جن صاحب نے کی تھی وہ سر چارلس کلیولینڈ ڈائرکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ محمد علی نے اس سازش میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سر چارلس ان سے سخت ناراض تھے۔ محکمۂ خفیہ پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی کا جو زبردست ہاتھ ہندوستان کی حکومت میں ہے وہ سب کو معلوم ہے اور اس کے افسرِ اعلیٰ کو ناخوش کرنے کے بعد محمد علی زیادہ عرصہ آزاد نہ رہ سکتے تھے۔

چھندواڑہ

چھندواڑہ وسطِ ہند میں ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ اپنے وطن سے دور اس جگہ نظر بند ہو کر بھی محمد علی بیکار نہ بیٹھے دونوں بھائیوں نے ایامِ اسیری کی فرصت کو غنیمت جان کر تاریخ عالم اور مذہب اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ محمد علی نے کئی معرکے کی قومی نظمیں تصنیف کیں۔ اس عرصے میں ان کی رہائی کی کوششیں برابر جاری رہیں لیکن گورنمنٹ جنگ کی وجہ سے اور بھی خائف تھی۔ اس لئے کسی طرح ان کو آزادی دینے پر تیار نہ تھی۔

مسلم لیگ کی صدارت

ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں نے محمد علی کو اپنی واحد سیاسی انجمن مسلم لیگ کا صدر منتخب کر کے ان کی غیر معمولی سیاسی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف کیا لیکن گورنمنٹ نے انہیں جلسے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے بجائے ان کی والدہ بی اماں مرحومہ نے شرکت کی اور کرسیِ صدارت پر محمد علی کی تصویر رکھ دی گئی۔

اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور قوم پرست بال گنگا دھر تلک نے ایک ریزولیوشن پاس کرایا جس میں گورنمنٹ سے علی برادران کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر اور کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی لاحاصل رہی لیکن اس واقعے سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں محمد علی کی کتنی قدر و منزلت قوم پرستوں کی جماعت میں کی جاتی تھی۔

اسی عرصے میں وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو اصلاحات کے لیے ابتدائی تحقیقات کرنے ہندوستان آئے۔ ملک کے تمام سیاسی لیڈروں نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ مولانا محمد علی نے بھی خواہش ظاہر کی کہ ان سے ملاقات کریں اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی ترجمانی کریں۔ مسٹر مانٹیگو نے بھی محمد علی کا ذکر سنا تھا اور ملاقات کرنی چاہتے تھے، مگر حکومتِ ہند نے اس ملاقات کو اپنے "اقتدار" کے لئے خطرناک سمجھا اور اجازت نہیں دی۔

پابند آزادی سے انکار

اسی سال حکومت نے عبدالمجید صاحب سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولیس کو چھندواڑے بھیجا کہ علی برادران کے سامنے ایک عہد نامہ پیش کریں جس پر دستخط کرنے سے ان کو رہائی مل سکتی تھی عہد نامہ کی رو سے ان کو یہ وعدہ کرنا تھا کہ جنگ کے دوران میں وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرینگے۔ جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ گورنمنٹ کے دشمنوں کو کسی قسم کی اخلاقی، عملی یا مالی مدد مل سکے اور نہ کوئی ایسی بات کریں گے

جس سے ملک کے دمن میں خلل ہو۔ علی برادران نے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۸ء میں ایک سرکاری کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ علی برادران کی نظربندی پر غور کر کے رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کے ممبران چھندواڑہ آئے، دونوں بھائیوں کے بیانات لئے اور پھر اپنی سفارشات پیش کیں۔ انہوں نے نظربندی کو بالکل جائز قرار دیا لیکن سفارش کی کہ اب سزا کافی مل چکی ہے اس لئے دونوں بھائی رہا کر دیے جائیں لیکن حکومت نے اس کو منظور نہیں کیا۔ مسز بیسنٹ اسی سال نومبر میں رہا ہوئیں اور انہوں نے فوراً علی برادران کی رہائی کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ وائسرائے سے ملیں مفصل گفتگو کی اور دلائل پیش کئے مگر وہاں تو وہی ایک جواب تھا کہ "ہرگز نہیں"!

زندان کی تبدیلی

چھندواڑہ کئی سال سے ان لوگوں کا وطن ہو گیا تھا مگر اب اس کو بھی چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں بھائیوں کی کوشش سے وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز بعد نماز جمعہ محمد علی نے ایک پرجوش اور زبردست تقریر کر ڈالی جس میں مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا اور بیداری کا پیغام دیا۔ حکومت کو یہ ناگوار گزرا اور ان کو بیتول جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جو تھوڑی بہت آزادی چھندواڑہ میں حاصل تھی وہ بھی سلب کر لی گئی۔

رہائی اور امرتسر کانگریس

علی برادران جیل ہی میں تھے کہ مہاتما گاندھی نے رولٹ بل کے خلاف تحریک سول نافرمانی شروع کی۔ تمام ملک میں جوشِ آزادی کی آگ بھڑک اُٹھی، اور حکومت نے جتنا زیادہ تشدد کیا اسی قدر تحریک زور پکڑتی گئی۔ اسی عرصے میں جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام ہوا اور خطرہ تھا کہ تحریک کہیں مسلح بغاوت کی صورت نہ اختیار کر لے۔ اس لئے گورنمنٹ نے اس غصہ کی لہر کو روکنے کے لئے ایک مدبرانہ چال چلی یعنی سب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ درشتی اور نرمی کو سمو کر ملک کے مزاج کو نئی اصلاحات کے سہنے کے لئے تیار کرے۔ اس طرح دسمبر ۱۹۱۹ء میں پانچ سال کی نظربندی اور قید کے بعد یہ دونوں بھائی آزاد ہوئے۔

کانگریس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر میں ہو رہے تھے اس لئے ان دونوں نے فوراً ادھر کا رُخ کیا۔ وہاں ان کا وہ شاندار استقبال ہوا کہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ راستے بھر ہر سٹیشن پر ہزارہا ہندو مسلمانوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ امرتسر کے سٹیشن پر جب ان کی گاڑی پہنچی تو ایک عظیم الشان مجمع نے قومی نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ جلوس مرتب ہو کر کانگریس پنڈال کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں مہاتما گاندھی اور دوسرے مقتدر رہنمایانِ قوم ان کے خیر مقدم کے لئے جمع تھے۔ جس وقت یہ دونوں کانگریس پنڈال میں داخل ہوئے تمام حاضرین جوش میں کھڑے ہو گئے اور پندرہ منٹ تک مسلسل تالیاں بجتی رہیں۔ پنڈت مالویہ نے ان دونوں بھائیوں کا

تعارف کرایا اور ان کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا۔

یادگار تقریر

کانگریس میں ایک پُرجوش تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے جو الفاظ کہے وہ بھی یادگار رہیں گے۔

"میں کہتا ہوں کہ اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہیے، مجھے دوبارہ عمر بھر کے لئے نظر بند ہو جانا چاہیے مسز بیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے مگر اس قسم کے مظالم کا خاتمہ ہو جانا چاہیے جیسے پنجاب میں ہوئے۔"

مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس میں بھی دونوں بھائیوں کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ اور اس کے بعد جب وہ دہلی آئے تو وہاں جس شان کا استقبال ہوا وہ شاید شاہانِ دہلی کو بھی کبھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

پیش کش سے انکار

مدت تک نظر بند رہنے اور کئی بار اخباروں کی ضمانتیں ضبط ہونے کی وجہ سے اس زمانے میں علی برادران کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ ان کے چند دوستوں اور قدر دانوں نے ہندو اور مسلمان قائدین کی ایک کمیٹی بنائی تاکہ معقول رقم جمع کرکے ان کی خدمت میں پیش کی جائے لیکن محمد علی نے اس رقم کو اپنے ذاتی خرچ کے لئے لینے سے انکار کر دیا اور روپیہ کو قومی اور ملکی کاموں کے لئے دے دیا۔

وفدِ خلافت

خلافت کانفرنس میں یہ طے پایا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے چند نمائندے ممالکِ غیر مثلاً امریکہ

انگلستان، ایران، عراق، ترکی وغیرہ جاکر وہاں مسلمانانِ عالم کے نقطۂ نظر کو پیش کریں اور اس غم وغصہ کا اظہار کریں جو تمام مسلمان برطانوی حکومت کی وعدہ خلافی پر محسوس کر رہے تھے۔

جنگ عظیم کے دوران میں مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوستانی مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ برطانوی مدبر مسلمانوں کے مذہبی جذبات و احساسات کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور مقامات مقدسہ پر خلیفۃ المسلمین ہی کا قبضہ رہے گا۔

یہی وعدہ تھا جس کی بنا پر مسلمان انگریزوں کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن ادھر جنگ ختم ہوئی اُدھر سب وعدے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے۔ اور ہندوستان کے مسلمان اپنی سادہ لوحی اور برطانیہ کی شاطرانہ سیاسی چالوں پر افسوس اور تعجب کرتے رہ گئے۔

مسلمانوں کو شکایت تھی کہ باوجود ان وعدوں کے مقاماتِ مقدسہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ تھریس یونان کے حوالہ کر دیا گیا۔ فرانس اور برطانیہ نے سلطنتِ عثمانیہ کا تمام مشرقی علاقہ دبا لیا، اور خلیفہ میثاق اقتدار کے بہانے سے ہر قسم کی طاقت اور قوت سے محروم کر دیا گیا مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ ان وعدوں کے مطابق خلیفہ کو پوری پوری آزادی دی جائے اور ممالکِ اسلامیہ و مقاماتِ مقدسہ پر حسبِ سابق خلافت کا قبضہ برقرار رکھا جائے۔

اِن وعدوں کے ایفا کی کوشش کرنے کے لئے وفد خلافت کی تجویز محمد علی کے دماغ میں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا مطالبہ اس قدر صریحی واقعات پر مبنی ہے کہ اگر معقول طریقہ سے کوشش کی گئی تو حکومت برطانیہ اُس کو ضرور منظور کر لیگی۔ برطانیہ کو اس کے وعدے یاد دلانے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اور ملکوں کو مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کر دیا تاکہ دُنیا کی رائے عامہ ان کے موافق ہو جائے۔

وائسرائے کو وعدوں کی یاد دہانی

وفد خلافت کے ولایت جانے سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک متحدہ وفد لارڈ چیمسفورڈ کے پاس گیا اور حکومت برطانیہ کے وہ تمام وعدے یاد دلائے جو اُس نے مسلمانوں کے ساتھ کر کے بھلا دیئے تھے۔ بھلا وائسرائے سے کیا کار برآری ہو سکتی تھی سوائے اِس کے کہ اُنہوں نے وقتی وعدہ کر لیا کہ وہ مسلمانوں کے خیالات و جذبات کو حکومت برطانیہ کی خدمت میں پہنچا دینگے۔ اس وفد کے ارکان میں سے چند نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مسٹر محمد علی جناح، ڈاکٹر کچلو وغیرہ

وائسرائے کے سامنے جو مدلل اور مبسوط اڈریس اس وفد نے پیش کیا وہ محمد علی ہی نے تیار کیا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ یادگار ہے۔ وفد نے وائسرائے سے کہا:-

"ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ برطانیہ کو خواہ کیسا ہی زبردست

سیاسی نفع ہو یا کتنا ہی بڑا اور زرخیز خطۂ زمین حاصل ہو لیکن اس سے تلافی نہیں ہو سکتی اخلاقی عزت کے اُس نقصان کی جو برطانیہ کے اقتدار کو ہوگا اگر وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کئے گئے۔

"اخلاقی رعب کا خاتمہ اس لئے اور گراں معلوم ہوگا کہ اس اعلانِ شاہی کی قلعی کھل جائیگی جو آپ کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہوتے پر شائع کیا تھا"

ولایت کا سفر ۱۹۲۰ء میں یہ وفد ولایت کے لئے روانہ ہوا، تاکہ کانفرنس امن کے اختتام سے پہلے انگلستان پہنچکر برطانوی حکومت پر زور ڈالا جائے کہ وہ مسلمانوں کے احساسات اور اپنے وعدوں کو یوں پامال نہ کریں۔

وفد کے صدر محمد علی تھے۔ ارکین میں سید حسین صاحب، مولٰنا سید سلیمان ندوی صاحب اور ابوالقاسم صاحب تھے۔ اور حسن محمد حیات صاحب سکرٹری تھے۔ یہ کہنا بیکار ہوگا کہ اگرچہ سب ارکین نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا لیکن روحِ رواں اِس وفد کے محمد علی ہی تھے۔ اس زمانے میں ان کو بس اسی کی دُھن تھی کہ کسی طرح ترکی اور ممالک اسلامیہ کو برباد ہونے سے بچالیں۔

انگلستان میں کوششیں جس روز یہ وفد وہاں پہنچا اُسی دن انگریزی اخباروں سے ارکینِ وفد کو معلوم ہوا کہ کانفرنس امن دو ہی تین دن میں ترکی کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ محمد علی نے فوراً

جاکر نہایت پُرزور برقی پیغام تمام اتحادی طاقتوں کے نمائندوں، اخباروں اور خصوصاً مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم اور مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کو بھیجے۔ اگلے روز جب یہ لندن پہنچے تو دارالعوام میں قسطنطنیہ کی واپسی پر بحث ہو رہی تھی۔

انگلستان میں یہ وفد تمام ذمہ دار اصحاب سے ملا، اور ان کو مسلمانوں کا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔ محمد علی نے متعدد زوردار تقریریں کیں جنکا بہت کچھ اثر رائے عامہ پر پڑا۔ مسٹر جارج لینسبری مشہور مزدور لیڈر نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ اور اکثر مقامات پر جلسے کرانے میں مدد دی۔

ریمزے میکڈانلڈ کی خفگی

اُسی زمانے میں مزدور پارٹی کی کانفرنس ہونیوالی تھی۔ محمد علی نے سوچا کہ یہ موقع برطانیہ کے عوام کے سامنے اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے اچھا ہے۔ اسی لئے انھوں نے کوشش شروع کی کہ ان کو چند منٹ تقریر کرنے کے لئے مل جائیں۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ پروگرام طے ہوچکا تھا اور ریمزے میکڈانلڈ صاحب جو سکرٹری تھے باوجود محمد علی سے پرانی ملاقات کے ان سے ناراض تھے۔ خفگی کا سبب یہ تھا کہ لندن پہنچنے پر محمد علی اور اراکین وفد میکڈانلڈ کے پاس کیوں نہ آئے، اور دوسرے لوگوں کے پاس کیوں گئے۔ اس واقعہ کے متعلق محمد علی کے الفاظ قابل ذکر ہیں جو انھوں نے کئی سال بعد ایک خط میں لکھے تھے۔

"جو شخص برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا وہ اس قدر کم ظرف و

تنگدل ؟ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ حزب عمال کے لیڈروں سے انکی اس قسم کی مخالفت تھی کہ میرا اُن سے ملنا اِن کو اتنا ناگوار ہوا جو شخص رشک و حسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ ہندوستان اور ترکی اور خود برطانیہ کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور خیال رکھے تو صرف اس کا کہ فلاں شخص حزب عمال کے اور لیڈروں سے کیوں ملا اور مجھ سے کیوں نہ ملا، اُس سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہوسکتی ہے ؟"

مزدور کانفرنس میں تقریر پھر بھی مسٹر جارج لینسبری کی کوشش سے محمد علی کو پانچ منٹ تقریر کرنے کی اجازت مل گئی جس انداز سے محمد علی نے تقریر کی اِس سے حاضرین اتنے محظوظ ہوئے کہ باوجود صدر کے کئی بار گھنٹی بجانے کے لوگ یہی چلاتے رہے کہ" انہیں اور بولنے دو" بجائے پانچ منٹ کے محمد علی نے پورے بیس منٹ تقریر کی اور سامعین پر نہ صرف اپنی سلاستِ زبان اور روانیِ بیان کا سکہ بٹھا دیا بلکہ انہیں بڑی حد تک اپنا طرفدار بنا لیا۔

لندن اور پیرس سے اخبار اس کے بعد محمد علی، مولانا سلیمان ندوی اور دوسرے حضرات نے فرانس میں بھی تقریریں کیں اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کی اور پھر روم جاکر پوپ سے ملے اور اسکو مسلمانوں کے احساسات و مذہبی جذبات سے آگاہ کیا۔ پوپ نے ان کے مقصد سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ترکوں

نے عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا ہے۔ اسی زمانے میں اپنے
کام کی اشاعت کے لئے محمد علی نے لندن سے "مسلم آؤٹ لک" (مسلمانوں
کا نظریہ) اور پیرس سے "ایکو ڈے اسلام" (اسلام کی آواز بازگشت)
نامی اخبارات جاری کئے۔

محمد علی نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ فرانس اور اٹلی ترکی پر زیادہ سخت
پابندیاں عائد کرنے پر اتنے مصر نہیں ہیں جتنی اور طاقتیں ہیں۔ اسلئے وہ
بہت سے فرانسیسی قائدین سے ملے اور یہ انکی کامیابی کی دلیل ہے کہ
فرانس کے اکثر مقتدر اخبارات نے ان کی تائید کی۔

لائڈ جارج سے ملاقات

آخر میں انہوں نے خود مسٹر لائڈ جارج، وزیر
اعظم برطانیہ سے ملاقات کی اور نہایت بیباکی
سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے۔ برطانیہ کے وعدے یاد دلائے
اور وعدہ خلافی کی شکایت کی۔

مگر ان سب کوششوں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا سوائے اسکے
کہ اتمام حجت ہو جائے اور برطانیہ کی وعدہ خلافی اور احسان فراموشی پر
مہر ثبوت لگ جائے۔ اکتوبر میں محمد علی اور ارکان وفد ہندوستان واپس
آگئے۔

تحریک عدم تعاون

ابھی وفد خلافت ولایت ہی میں تھا کہ ہندوستان
میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ کانفرنس
ہوئی جس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر سر تیج بہادر

وغیرہ شامل تھے ۔ اکثریت نے طے کیا کہ خلافت اور ترکوں کو برطانیہ نے جو نقصان پہنچایا ہے اسکے خلاف ایک مؤثر احتجاج کیا جائے ۔

خلافت کانفرنس نے اپنے ایک جلسہ میں طے کیا کہ مسلمان مہاتما گاندھی کی قیادت میں کام کرینگے ۔

۲۲ رجون کو وائسرائے کے نام ایک بیان بھیجا گیا جس میں اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اگر حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کے مطالبات منظور نہیں کرا سکتے تو وہ استعفے دیدیں اور ان کی احتجاجی تحریک کی قیادت کریں ۔

اس کے بعد مہاتما گاندھی نے محمد علی کو ولایت ایک برقی پیغام بھیجا جس میں انہیں اُس خط کی جو وائسرائے کو بھیجا گیا تھا اطلاع دی اور یہ اطمینان دلایا کہ ہم نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے اعلان کر دیا ہے کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۱ء تک مسلمانوں کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو ہم عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے پر مجبور رہوں گے ۔

خلافت وسوراج

وفد کے ناکام واپس آنے پر مُلک میں حکومت کے خلاف غم وغصہ کی ایک نئی لہر دوڑ گئی مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ حکومت کے وعدے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو وہ کس طرح اُن کو بھول جاتی ہے ۔ ایسی حکومت کس برتے پر ان سے تعاون کی امید کر سکتی تھی ۔

یہ بھی اب ظاہر ہو گیا تھا کہ مشرق میں برطانوی اقتدار کی جڑ ان کا

ہندوستان پر قبضہ ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو ممالک اسلامی سے برطانوی اثر زائل کرنا آسان ہوگا۔

ہندوؤں نے بھی دیکھا کہ جس طرح حکومت نے مسلمانوں سے وعدے کرکے پورے نہیں کئے اسی طرح اور ہندوستانیوں کے ساتھ بھی کریں گے حکومت خود اختیاری کا سبز باغ جو جنگ کے شروع ہونے پر دکھایا گیا تھا اب فریب نظر ثابت ہو چکا تھا۔ دونوں قوموں نے مشترکہ قوت کے ساتھ وہ تحریک شروع کی جو موجودہ ہندوستان کی تاریخ میں تحریک خلافت و سوراج کے نام سے یادگار رہیگی۔

یہ بے ہتھیار کی جنگ جو مہاتما گاندھی اور مولینا محمد علی کی قیادت میں شروع ہوئی ہندوستان کی تاریخ قومیت کا پہلا سنہری باب ہے۔ اسکا مفصّل ذکر خود ایک ضخیم کتاب کا محتاج ہے اس لئے ہم ان چند واقعات پر اکتفا کریں گے جو بلا واسطہ مولینا محمد علی کی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔

عدم تعاون کی تحریک کا ایک پہلو سرکاری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ بھی تھا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم گورنمنٹ کے کالجوں اور سکولوں کو خیرباد کہکر قومی جنگ میں شریک ہو چکے تھے۔ قومی لیڈروں کا ارادہ یہ تھا کہ تمام سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں کو بند کرکے قومی ادارے قائم کئے جائیں۔ اسی ارادہ سے محمد علی اپنے رفقاء کے ساتھ علی گڑھ آئے تاکہ پہلے یہاں کے ارباب حل وعقد کو دعوت دیں کہ حکومت کا دامن چھوڑ کر قوم اور مذہب کا ساتھ دیں اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو طالبعلموں کو ترغیب دیں کہ

کالج چھوڑدیں محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اراکین کورٹ سے اپیل کی کہ سرکاری تعلق کو منقطع کرکے کالج کو ایک قومی ادارہ بنائیں۔ کورٹ میں سرکاری عنصر آج کی طرح اس وقت بھی غالب تھا۔ اس لئے یہ تجویز ٹھکرادی گئی۔

پھر محمد علی نے یونین میں طلباء کے سامنے ایک زبردست تقریر کی اور کہا کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے لئے انہیں تعلیم کو خیرباد کہکر قومی جنگ میں شریک ہوجانا چاہئے۔ تقریر اتنی پُر اثر تھی کہ اسی وقت سینکڑوں طالبعلموں نے اعلان کردیا کہ وہ کالج چھوڑدیں گے۔ ایک بڑی تعداد نے یہ اعلان فقط وقتی جوش میں کیا تھا لیکن پھر بھی ان طالبعلموں میں سے محمد علی کو بہت سے کام کے رفقا رہے۔

محمد علی اور ان کے ساتھی علی گڑھ میں اولڈ بوائز لاج میں ٹھہرے ہوئے تھے جو خود انہی کی کوششوں سے تعمیر ہوا تھا۔ خداوندان کالج کو یہ کب منظور تھا کہ یہ "باغی اور سرکش" حدود کالج میں رہ سکیں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ جب اس سے انکار ہوا تو کالج کے افسروں نے وہ کیا جو آج تک نہ ہوا تھا یعنی کالج کی حدود میں پولیس بلالی گئی۔ علی گڑھ کے قابل فخر اولڈ بوائز خود ان کے بنائے ہوئے اولڈ بوائز لاج سے نکلوادئے گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

علی گڑھ کالج سے محمد علی کی محبت ضرب المثل تھی یہاں کے زمین و آسمان، عمارات اور مکانات غرض چپے چپے سے محمد علی کو عشق تھا۔ یہ ان کی مادرِ علمی تھی جس کی گود میں انہوں

نے پرورش پائی تھی اور انہیں اس سے اسی قدر محبت تھی جتنی بیٹے کو ماں سے ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت جب مسلمانوں کی عزت کا سوال تھا محمد علی نے ذاتی محبت کو قومی محبت پر قربان کر دیا اور جس کالج کے لئے کبھی وہ جان دینے کو تیار رہتے تھے اسی کے احاطہ کے باہر انہوں نے اسکے مقابلہ میں ایک نیا ادارہ قائم کیا جس کا نام "جامعہ ملیہ اسلامیہ" رکھا گیا۔

علامہ شیخ الہند مرحوم اس درسگاہ کے بانی تھے۔ حکیم اجمل خان مربّی اور محمد علی اس کے پرنسپل۔ جو طالب علم ایم۔ اے۔ او کالج چھوڑ کر آتے تھے وہ جامعہ میں داخل ہو جاتے تھے۔ دو دو ادارے جن کے درمیان مشکل سے نصف میل کا فاصلہ ہوگا دونوں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم ہوئے تھے۔ دونوں کی بنیاد خلوص اور درد اسلامی پر رکھی گئی۔ مگر ۱۹۲۰ء میں ان دونوں کی حالت میں عبرت انگیز فرق تھا۔ ایک طرف عظیم الشان عمارتیں تھیں لیکن خالی۔ طالب علم یا تو کالج چھوڑ چکے تھے یا ان "باغیوں" کے ڈر سے گھر بھیج دئے گئے تھے دوسری طرف چند بوسیدہ خیمے تھے مگر طالب علموں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے۔ ایک طرف اگر شاندار لکچر روم اور ہال خالی پڑے تھے تو دوسری طرف درختوں کے نیچے فرش خاک یا چٹائیوں پر درس ہو رہا تھا۔ ادھر اگر کالج کا خزانہ روپئے سے پُر تھا تو اُدھر جامعہ کے بانی اور اساتذہ اور طالب علموں کے دل جوش قومی سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف مادی ساز و سامان کی فراوانی لیکن اخلاقی جراٴت اور حوصلے کا فقدان تھا تو دوسری طرف بے سرو سامانی میں بھی حوصلے بلند اور ارادے مستحکم تھے۔ ایک طرف اگر سرکاری امداد پر بھروسہ تھا تو دوسری طرف

تائیدِ الٰہی پہ۔

اِس طرح جامعہ ملیہ کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی سیاسی مصروفیات کے باعث محمد علی کو جامعہ کی باگ اپنے عزیز دوست خواجہ عبد المجید کے ہاتھ میں دینی پڑی۔ مگر اس ادارے سے ان کو ہمیشہ وہی دلچسپی اور محبت رہی اور جامعہ کی ہر امکانی مدد میں انہوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔

ناگپور کانگریس و خلافت کانفرنس

جامعہ قائم کرنے کے بعد محمد علی نے ملک کا ایک دورہ کیا اور ہر جگہ لوگوں کو ترکِ موالات کی تحریک کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا تاریخی اجلاس ہوا۔ عدم تعاون کا پروگرام منظور کیا گیا۔ اور مہاتما گاندھی کو اس کی قیادت سونپ دی گئی۔ کانگریس کے ساتھ ہی خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا، اور وہاں بھی ترکِ موالات کی تحریک میں شرکت کی تجویز پاس ہو گئی، اور مہاتما گاندھی کی قیادت منظور کر لی گئی۔

کانگریس کے اس اجلاس میں اعتدال پسند بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے تاکہ تحریکِ عدم تعاون کی مخالفت کریں اور "احتجاج" کو بدستور "آئینی" طریقے پر جاری رکھیں۔ "معتدل" حضرات میں سی۔ آر۔ داس، پنڈت مدن موہن مالویہ، اور محمد علی جناح پیش پیش تھے۔ محمد علی نے ان سب کو سمجھانے کی انتہائی کوشش کی لیکن پنڈت مالویہ اور جناح نے "آئینیت" کا دامن نہ چھوڑا۔ البتہ کئی دن کی مسلسل بحث و مباحثہ کے بعد وہ سی۔ آر۔ داس کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ کانگریس کئی لحاظ سے نہایت اہم تھی۔ اوّل تو ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک متحدہ لائحۂ عمل منظور کیا۔ دوسرے "معتدل" فریق ہمیشہ کے لئے کانگریس سے خارج ہوگیا۔ یہاں سے کانگریس کا "غیر آئینی" اور "باغیانہ" دور شروع ہوتا ہے۔ تیسرے محمد علی کے جوہر قیادت کے سب قائل ہوگئے اور مہاتما گاندھی کے بعد ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کیا گیا۔ اب تک محمد علی کی علمی قابلیت، سلجھے ہوئے دماغ، اور ان کی تقریر کی شہرت تھی۔ اب وہ زمانہ آیا کہ لوگ ان کی سرفروشی، اور حب الوطنی کے جوہر دیکھیں۔

مہاتما گاندھی اور مولینا شوکت علی صاحب کے ساتھ انہوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ محمد علی اور گاندھی، گاندھی اور محمد علی۔ یہی دو نام ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ اور ان ناموں کا اتحاد ہندو مسلمانوں کے عملی اتحاد کی نشانی بن گیا تھا۔ اس سفر میں محمد علی نے وہ ولولہ انگیز اور زبردست تقریریں کیں کہ ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک حب الوطنی کی ایک آگ لگا دی۔ ہر شخص کو آزادی کا متوالا بنا دیا۔ بڑے بڑے آستانۂ حکومت کے پرستار سرکار سے منحرف ہوگئے۔ ملک بھر حکومت کا مخالف ہوگیا۔ انگریز کا ڈر ہندوستانی کے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ قیدخانوں کو لوگ اپنا گھر سمجھنے لگے۔ لاٹھیاں اور گولیاں کھانا ایک کھیل ہوگیا۔ اتحاد کا حال یہ تھا کہ ہندو "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے تھے اور مسلمان "بھارت ماتا کی جے" پکارتے تھے۔ ملک کے

گوشے گوشے سے اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ یہی تھی کہ "بولو مہاتما گاندھی کی جے" "بولو مولینا محمد علی کی جے"۔

مدراس کی تقریر

خلافت کی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی اسلئے بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ محمد علی اور ان کے رفقاء کو ملکی مفاد کا اتنا خیال نہیں ہے جتنا مذہب کا جوش ہے۔ اس زمانے میں افغانستان کے حملے کی افواہ بھی مشہور کر دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مدراس کے مقام پر محمد علی نے جو تقریر کی تھی وہ یادگار رہے گی۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے اپنی حب الوطنی کے متعلق تمام شکوک کو یہ کہ کر مٹا دیا کہ:۔

"اگر کوئی غیر ملکی طاقت خواہ وہ جرمنی ہو یا روسی یا ٹرکی یا افغانستان ہمارے ملک پر حملہ کرے گی ہم سب سے پہلے اپنے ملک کی حفاظت میں جان دینگے۔ ہم ایک دفعہ غلام بنائے جا چکے ہیں۔ ہمیں دوبارہ غلام بننے کی کوئی خواہش نہیں ہے"۔

عدم تشدد

محمد علی نے شروع سے عدم تشدد کو اس تحریک کا ادراہنا بنیادی اصول مان لیا تھا لیکن ان کی جوشیلی تقریروں کے متعلق حکومت کا خیال تھا کہ وہ لوگوں کو تشدد کی ترغیب دیتی ہیں۔ اسی زمانے میں پنڈت مالویہ کی کوشش سے لارڈ ریڈنگ اور مہاتما گاندھی کی ملاقات ہوئی جس کے دوران میں وائسرائے نے شکایت کی کہ علی برادران کی تقریریں حکومت کے خلاف نہ صرف بغاوت بلکہ تشدد کی

ترغیب دیتی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا یہ محض غلط فہمی ہے کہ علی برادران تشدد کی تعلیم دے رہے ہیں حقیقت میں یہ دونوں بھائی مکمل طور پر عدم تشدد کے پابند ہیں۔ بہرحال مہاتما گاندھی نے محمد علی کو لکھا کہ تم اس کے متعلق ایک بیان شائع کردو۔

معافی؟

اس زمانے میں مشہور کیا گیا کہ علی برادران نے حکومت سے معافی مانگ لی۔ مگر لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے زبردست "باغی" حکومت کے ڈر سے معافی نامہ لکھ دیں۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی فرمائش کے بموجب دونوں بھائیوں نے ایک بیان شائع کیا تھا جس میں صراحت کے ساتھ انہوں نے عدم تشدد کے اصول کو تسلیم کیا تھا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ ان کی تقریروں سے یہ مطلب نکالا گیا کہ وہ تشدد کے حامی ہیں۔ اس بیان کو حکومت کے موافقین نے علی برادران کی معافی کے نام سے مشہور کیا۔

کراچی کا مقدمہ

کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اور اس میں محمد علی کی صدارت میں ایک رزولیوشن پاس کیا گیا جس کی رو سے اعلان کیا گیا کہ مسلمان کے لئے اسلام کے دشمنوں کی اعانت اور خدمت حرام ہے۔ اس تجویز کی تائید سارے ہندوستان میں نہ صرف مسلمان علماء نے کی بلکہ ہندو پنڈتوں نے بھی کہا کہ ہمارے مذہب کی رو سے بھی ظالم حکومت کی امداد حرام ہے۔ مہاتما گاندھی اور سینکڑوں ہندو لیڈروں نے اس کی موافقت کی اور کانگریس نے

بھی اسی مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا۔

اسی ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران پر ترغیب بغاوت کا الزام لگایا گیا اور کراچی میں مقدمہ چلایا گیا۔ محمد علی اور انکے ملزم رفقاء نے نہایت بے پروائی اور اطمینان سے مقدمے کی کارروائی کو سُنا اور جب دو سال قید با مشقت کا حکم سُنایا گیا تو ہنستے ہوئے جیل چلے گئے۔

رہائی اور کانگریس کی صدارت

محمد علی کے ایام اسیری میں ملک میں جو جو انقلابات ہوئے وہ لوگوں کو اب بھی یاد ہونگے ان کے بعد ہزاروں آدمی جیل گئے۔ مہاتما گاندھی اور تمام لیڈر قید کر دیے گئے۔ مگر جو آگ محمد علی کی گرفتاری نے لگائی تھی وہ نہ کم ہوئی۔ دو سال بعد اگست ۱۹۲۳ء میں محمد علی رہا ہو گئے۔ اس موقع پر انہوں نے جو بیان دیا اس کا ایک فقرہ نہایت مؤثر تھا:-

"میں ایک چھوٹے جیل خانہ سے نکل کر بڑے جیل خانے میں آگیا ہوں۔ مجھے بڑودا جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں۔ اور اِس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے"

اسی سال محمد علی کی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف میں ان کو وہ اعزاز نصیب ہوا جس سے بڑھکر کسی ہندوستانی کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی یعنی کانگریس کی صدارت۔ محمد علی کا خطبۂ صدارت اپنے غیر معمولی

حجم اور ادبی چاشنی کی وجہ سے یادگار رہے گا۔ خطبہ کیا تھا ہندوستان کی تحریک آزادی کی ۱۹۲۳ء تک کی تاریخ تھا۔ یہ خطبہ اسلام اور جذبۂ قومیت کے اتحاد کی بھی بہترین مثال تھا۔ "اللہ اکبر" سے شروع ہوتا تھا اور "بندے ماترم۔ مہاتما گاندھی کی جے" پر ختم۔ اس خطبے میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی پُرزور اپیل کی اور بتایا کہ کس طرح دونوں قوموں کا مفاد اشتراکِ عمل پر مبنی ہے۔

دورِ صدارت

محمد علی کا دورِ صدارت ملک کی تاریخ میں نہایت اہم سال تھا۔ تحریک عدم تعاون کا ردِ عمل شروع ہو چکا تھا کچھ لوگ پنڈت موتی لال کی قیادت میں مجالس مقننہ میں جانا چاہتے تھے۔ محمد علی خود اس کے خلاف تھے لیکن انہوں نے سوراج پارٹی کے اراکین کے ساتھ نہایت رواداری کا سلوک کیا اور ان کو اپنی رائے کے اظہار کا پورا موقع دیا۔

اسی زمانے میں فرقہ وارانہ تحریکیں بھی زور پکڑتی جارہی تھیں۔ سوامی شردھانند نے جیل سے معافی مانگ کر رہا ہونے کے بعد شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کردی تھی۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں شروع کیں اور کوشش کی کہ محمد علی کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں لیکن محمد علی نے ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے سے انکار کردیا اور اپنی قومی و ملکی خدمات میں مصروف رہے۔

فرقہ وارانہ فسادات

یہ فرقہ وارانہ تحریکات اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتی

تھیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب تحریک ترک موالات کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا دور دورہ تھا۔ ایک یہ زمانہ آیا کہ دوسرے تیسرے مہینے ملک کے کسی نہ کسی گوشہ سے ہندو مسلم فساد کی خبر آتی تھی۔ بہت سے سابق قوم پرست اب کھلم کھلا فرقہ پرستی کی تعلیم دے رہے تھے۔ کوئی شدھی میں مصروف تھا تو کوئی تنظیم میں۔ ہندو مسلمانوں کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور مسلمان ہندوؤں کو لیکن محمد علی کا نظریہ تھا کہ کسی ایک فرقہ کو موردِ الزام ٹھہرانا لاحاصل ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ اس قسم کے فسادات کا ہونا لازمی ہے۔ انہوں نے اتحاد پیدا کرانے کی کوشش جاری رکھی۔ ملک بھر میں مارے مارے پھرے۔ یونین کانفرنس منعقد کرائی۔ ہندو مسلمان لیڈروں کی خوشامد کی لیکن ساری دوڑ دھوپ بیکار ثابت ہوئی۔ اور ملک کی سیاسی فضا بد سے بدتر ہوتی گئی۔

حجاز و حج

اسی زمانے میں حجاز میں غیر معمولی انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ شریف حسین اور ابنِ سعود کی جنگ جاری تھی حکومت نے ایک اعلان شائع کیا جس میں حجاز کی حالت ناقابلِ اطمینان بتائی گئی اور حاجیوں کو "مشورہ" دیا گیا کہ وہ حج کو ملتوی کر دیں۔ محمد علی نے اس کی سخت مخالفت کی اور ملک بھر میں کوشش کی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں حج کو جائیں۔ ہزاروں حاجی اس سال محمد علی کی کوشش سے گئے اور کسی کا بال بھینکا نہ ہوا۔

شریف حسین کی بداعمالیوں کی وجہ سے محمد علی اس کے مخالف تھے اور

چونکہ ابنِ سعود نے اعلان کیا تھا کہ وہ شخصی حکومت نہیں بلکہ حجاز کی جمہوری حکومت قائم کرے گا اس لئے اس کی موافقت کر رہے تھے۔ مگر ابنِ سعود کی مخالفت اس کے "وہابی" ہونے کے سبب سے نہایت زوروں پر تھی۔ اسی سلسلے میں محمد علی کی بھی شدت سے مخالفت کی گئی۔ طرح طرح کے الزامات لگائے گئے مگر انہوں نے اپنی رائے کو نہیں بدلا۔ مزاراتِ مقدسہ کے انہدام کے مسئلہ میں محمد علی مخالفین ابنِ سعود کی بھیجی ہوئی خبروں پر یقین کرنے سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے نمائندے خود جا کر صورتِ حال کا معائنہ کریں۔

مگر اصول پرستی اس کا نام ہے کہ علی الاعلان ابنِ سعود کے حامی ہونے کے باوجود جس وقت خبر آئی کہ اس نے حجاز کی "بادشاہی" قبول کر لی ہے، محمد علی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے۔ وہ فطرتاً جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے اور خانۂ خدا پر کسی شخصی حکومت کا قبضہ ہونا انہیں ہرگز گوارا نہ تھا۔

مؤتمرِ اسلامی

سنہ ۱۹۲۶ء میں ابنِ سعود نے مؤتمرِ اسلامی کا اعلان کیا اور محمد علی مع وفدِ خلافت کے اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ خود ابنِ سعود نے مؤتمر کی صدارت کی مگر محمد علی رعب میں آنے والے نہ تھے۔ انہوں نے بھرے جلسے میں ابنِ سعود کو مخاطب کر کے بیباکانہ طریقہ سے تقریر کی اور کہا کہ اسلام نے شخصی حکومت اور ملوکیت کی بیخ کنی کی ہے۔ تم جو اپنے آپ

کو رسولؐ کا نائب بتاتے ہو کیوں قیصر و کسرٰے کی پیروی میں "بادشاہی" قائم کر رہے ہو۔

حجاز میں منہدم کی ہوئی عمارات مقدسہ کو بھی محمد علی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جب ابن سعود نے ان کو دوبارہ تعمیر کرانے کا ذمہ نہیں لیا تو ان کی مخالفت اور مستحکم ہو گئی۔

فرقہ پرستی

اب وہ زمانہ آتا ہے جب یہ خیال کیا جانے لگا کہ محمد علی کا رجحان قوم پرستی سے ہٹ کر فرقہ پرستی کی طرف ہونے لگا ہے۔ ملک کی فضا اس وقت عجیب تھی۔ فرقہ پرستانہ ذہنیت کا دور دورہ تھا۔ شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ اور تنظیم کا چرچا تھا۔ ہندو مسلم فسادات عام تھے۔ محمد علی اس قسم کی تحریکات سے شروع ہی میں بیزاری کا اظہار کر چکے تھے۔ اور مسلمانوں کے فرقہ پرست اور دشمنِ اتحاد فریق سے جنگ آزما تھے۔ مگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جس دلیری سے وہ مسلمان فرقہ پرستوں سے لڑ رہے تھے اس طرح ہندو لیڈر اور اکثر کانگریسی ہندو اپنے یہاں کے فرقہ پرستوں سے لڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ہندو مہاسبھا، مونجے اور سشر دھانند کے خلاف محاذ جنگ قائم کرے۔

مئی ۱۹۲۶ء میں سپیشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی غرض و غایت محمد علی نے یوں بیان کی کہ "جب پنڈت موتی لال نے مہاسبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کر دیا تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم نے بڑھ ہو کر ان سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ امید نہ رکھیں۔"

بہرحال اِس کانفرنس میں کوئی تجویز ایسی پاس نہیں ہوئی جس میں اعلانِ جنگ یا کانگریس اور ہندوؤں سے بیزاری کا اظہار ہو بلکہ کانفرنس کے بعد محمد علی نے جو مسلمانوں کے نام اپیل کی اس میں فرمایا:۔

"یہ مُلک کے لئے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہلِ ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اُٹھائیں تو سر جھکا دو اگر چھُری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔"

مگر یہ اب صاف ظاہر تھا کہ وجہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اشتراکِ عمل اور اتحاد جو اب تک محمد علی اور دیگر کانگریسی لیڈروں کے درمیان رہا تھا اب آہستہ آہستہ مفقود نہیں تو کمزور ضرور ہوتا جا رہا تھا۔

کتابِ راجپال

جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک شخص راجپال نامی نے ایک کتاب شائع کی جس میں رسولِ کریمؐ پر نہایت بے ادبانہ اور رکیک حملے کئے گئے تھے۔ اِس کتاب کے شائع ہوتے ہی مہاتما گاندھی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مسلمانوں میں تو اس کی اشاعت سے ایک آگ لگ گئی۔ ہر شخص اس کی ضبطی اور مصنف کو سزا دہی کا مُدعی تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ میں جسٹس دلیپ سنگھ نے مصنف کو بری کر دیا اس پر شورش اور بڑھی اور "جسٹس دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ" کی آواز تمام اسلامی ہند سے بلند ہوئی۔ ایسے وقت میں عوام کی رائے کی مخالفت کرنے کی ہمت

سوائے محمد علی کے کوئی نہ کر سکتا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ دلیپ سنگھ نے جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کی۔ قصور اس کا نہیں بلکہ قانونِ ضابطۂ فوجداری کا ہے کہ اس میں کوئی صاف اور واضح دفعہ مذہبی پیشواؤں کی توہین کو روکنے کے لئے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہنگامے میں محمد علی کی کون سُنتا تھا۔ رائے عامہ کے سیلاب کے ساتھ بہنا آسان ہے اس کی مخالفت ہمت اور جوانمردی کا کام ہے۔ محمد علی کو دشمنوں نے گالیاں دیں۔ دوستوں نے بُرا بھلا کہا۔ مگر انھوں نے اپنی رائے کو نہ بدلا۔ بلکہ پیہم کوششوں سے شورش کو ٹھنڈا کیا۔ اسی وقت انہوں نے ایک قانون کا مسودہ بنایا جس کی رُو سے کسی مذہب یا مذہبی پیشوا کی توہین قانونی جُرم قرار دی جائے یہ قانون سر ذوالفقار علی خان نے پیش کیا اور کثرتِ رائے سے اسمبلی میں پاس ہوا۔

آل پارٹیز کانفرنس

باوجود ناموافق فضا کے محمد علی اب بھی اسی کوشش میں تھے کہ کسی طرح ہندو مسلمانوں میں مصالحت ہو جائے۔ کئی "یونٹی کانفرنسیں" ہوئیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۲۷ء میں پھر کوشش ہوئی کہ ایک کانفرنس تمام قابلِ ذکر انجمنوں کے نمائندوں کی "آل پارٹیز کانفرنس" کے نام سے کی جائے۔ کانفرنس کے ابتدائی جلسوں میں مُلک کے نمائندوں کی کافی تعداد شریک ہوئی۔ مگر جب طرفین تعصُّب کا جواب تعصُّب سے اور غصّہ کا جواب غصّہ سے دیں تو صلح کیا خاک ہوگی۔ مہا سبھا اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی تو تو میں میں کے بعد یہ کانفرنس بھی "ملتوی" ہوئی۔

"چودہ نکات"

جب دوسری کوششیں ناکام رہیں تو محمد علی نے چاہا کہ مسلمان پہلے آپس میں متفق ہو جائیں اور پھر کانگریس سے اتفاق کرلیں تاکہ قومی آزادی کا کام جاری رہے۔ دہلی میں اسمبلی کے اجلاس کے زمانے میں انھوں نے جناح صاحب کی شرکت میں مسلمانوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کی۔ محمد علی کی کوشش سے اکثریت مخلوط انتخاب کے موافق ہوگئی۔ اور "چودہ نکات" منظور کئے گئے جن پر سب متفق تھے۔ یہ چودہ نکات اب ملک بھر میں "جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہیں اور مسلمانوں کی سیاسی انجمنوں کی عقل و فکر کا مدار انہی پر ہے۔ یہ نکات محمد علی نے کانگریس کے سامنے پیش کئے اور وہاں بھی منظور کرالئے۔ مگر فرقہ پرست ہندوؤں اور فرقہ پرست مسلمانوں کی مخالفت جاری رہی اور ملک کی فضا میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں انگلستان کی مزدور گورنمنٹ نے سائمن کمیشن کا تقرر کیا جس کے رکن سب انگریز تھے اور جس کا مقصد ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک دستورِ اساسی تجویز کرنا تھا۔ کانگریس تو اس کمیشن سے بیزار تھی ہی۔ معتدل طبقہ نے جب دیکھا کہ حکومت نے اس کو بھی نظر انداز کیا ہے تو وہ بھی مخالف ہو گیا۔ مسلمانوں کے جتنے خطاب یافتہ خود ساختہ "لیڈر" تھے وہ تو اس کمیشن سے تعاون کرنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن بعض قوم پرست مسلمان بھی ہندوؤں سے اتنے دل برداشتہ تھے کہ اس کمیشن سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

سر محمد شفیع سرکاری پارٹی کے سرگروہ تھے۔ اتفاق سے اس سال انکا انتخاب مسلم لیگ کی صدارت کے لیئے ہوا تھا۔ جناح صاحب جو لیگ کی کاؤنسل کے صدر تھے وہ کمیشن کے مخالف تھے۔ غرض ان دو صدروں میں مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس سال لیگ کے دو اجلاس ہوئے۔ سر شفیع نے لاہور میں جلسہ کر کے کمیشن کی موافقت کا ریزولیوشن پاس کرایا۔ کلکتہ میں محمد علی کی کوشش سے کمیشن کی مخالفت کی تجویز پاس ہوئی اور چودہ نکات جن میں بہت سی شرطوں کے ساتھ مخلوط انتخاب کی حمایت تھی منظور ہو گئے۔

محمد علی نے کمیشن کی مخالفت میں تقریریں کیں، مضامین لکھے اور ہر طرح بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔

نہرو رپورٹ سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے وقت جو تھوڑا بہت اتفاق رائے اور اتحادِ عمل ہندوؤں اور مسلمانوں میں قائم ہوا تھا وہ نہرو رپورٹ نے بالکل ہی ختم کر دیا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا تھا کہ اگر ان میں اتنی قابلیت ہو تو ایک دستورِ اساسی بنا کر دکھائیں۔ اس کے جواب میں بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی جس نے ایک کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں بنا دی تاکہ وہ ہندوستان کیلئے ایک دستورِ اساسی تیار کرے۔

اگست سنہ ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ میں یہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں پیش کی گئی۔ محمد علی اس وقت علاج کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ شوکت علی شریک جلسہ تھے۔

رپورٹ میں "حکومت بہ طرزِ نو آبادیات" کے اصول پہ دستور اساسی
تیار کیا گیا تھا مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کے پورے "چودہ نکات"
اس میں نہیں رکھے گئے۔ حسرت موہانی اور شوکت صاحب نے رپورٹ
سے اختلاف کیا۔ مگر وہ بہ کثرتِ رائے پاس ہوگئی۔ محمد علی جب اپنے
علاج کو بیچ میں چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے بھی اس
رپورٹ کی مخالفت کی۔ عام مسلمان رپورٹ سے ناراض تھے۔ مگر
ایک معقول تعداد قوم پروروں کی اس کی حامی تھی۔

نہرو رپورٹ کے شائع ہوتے ہی نااتفاقی اور فرقہ وارانہ مخالفتوں کا
بازار گرم ہوگیا۔ کانگریس نے رپورٹ کو منظور کرلیا۔ اس سے محمد علی اور بھی
بددل ہوگئے۔ قومی کنونشن میں مخالفت کی مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ محمد علی کی
مخالفت دو وجوہ پر مبنی تھی۔ ایک تو یہ کہ رپورٹ میں مکمل آزادی کا نصب العین
بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے مطالبات منظور
نہیں کئے گئے تھے۔

اس وقت محمد علی نے ایک دردناک بیان شائع کیا جس میں کانگریس
سے اپنے اختلافات کی وجوہ کو بیان کیا۔ خواہ کانگریس کا ساتھ چھوڑنے میں محمد علی
حق بجانب ہوں یا نہ ہوں یہ بیان پڑھنے کے بعد ان کے خلوص سے کوئی انکار
نہیں کرسکتا۔

مسلم کانفرنس

دل برداشتہ اور مایوس انسان کہاں سے کہاں پہنچتا
ہے۔ کانگریس کو چھوڑ کر محمد علی آل پارٹیز مسلم کانفرنس

میں شریک ہوئے جو آغا خان کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ قوم پرست مسلمانوں نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ صدر اور اراکینِ کانفرنس کی اکثریت محمد علی کے تخیل مکمل آزادی سے کوسوں دور ہیں۔ سر شفیع مرحوم اس کے روحِ رواں تھے اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ دونوں جو آج تک ایک دوسرے کے شدید سیاسی مخالف تھے۔ آج ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہیں۔ کانفرنس کے اراکین نے محمد علی کو شریک کرنے کیلئے یہ طے کیا کہ کانفرنس اپنا سیاسی نصب العین مقرر نہ کرے تاکہ ہر جماعت کو اختیار رہے کہ وہ اپنے اپنے نصبُ العین پر قائم رہے۔ مگر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے سب جماعتیں اشتراکِ عمل کریں۔

سر محمد شفیع نے اصل تجویز پیش کی جس میں مسلمانوں کے مطالبات واضح کئے گئے تھے اور یہ اعلان تھا کہ جب تک یہ منظور نہ کئے جائیں مسلمان کسی دستورِ اساسی کو قبول نہ کرینگے۔

محمد علی نے اس موقع پر اس ریزولیوشن کی تائید میں جو تقریر کی اس کا ایک حصہ قابلِ ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے ان کے دل میں اب بھی اتحاد کا جذبہ کس زور شور سے موجود تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

"میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں۔ میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں۔ میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے

نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کی غلامی قبول کرنی پڑے تو میں اسے قبول کرلوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن واتحاد کا حامی ہوں"

گول میز کانفرنس

کیا وجوہ تھے جن کی بنا پر محمد علی جیسے شخص نے جو مکمل آزادی کے حامی تھے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت کو منظور کرلیا؟ یہ بحث اب بیکار ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ باوجود شدید علالت کے محمد علی نے یہ طول طویل سفر قوم اور ملک کی خدمت کے لئے اختیار کیا۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ شیر مرد اپنے آخری سفر پر روانہ ہو رہا ہے!

انگلستان جاکر محمد علی نے ہندو اور مسلمان مندوبین کے درمیان مصالحت کی پوری کوششیں کیں تاکہ کم سے کم دیار غیر میں تو آپس کی ناچاقیوں کا راز نہ کھلے۔ مگر یہاں مسلمان مندوبین چن چن کر ایسے بھیجے گئے تھے جو کسی طرح مصالحت پر آمادہ نہ ہوں۔ ادھر ہندو بھی ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے تھے۔ ایک کا ایمان اگر فرقہ دارانہ نیابت تھی تو دوسرے کا دھرم مشترکہ انتخاب۔ بہ حال باوجود شدید علالت اور نقاہت کے محمد علی نے ایک ایسی تجویز تیار کی تھی کہ اگر فرشتۂ موت نے مہلت دی ہوتی تو اغلب تھا کہ وہ سب کو اس تجویز پر متفق کرانے پر کامیاب ہوجاتے۔

تاریخی تقریر

گول میز کانفرنس میں انہوں نے وہ زبردست تقریر

کی جس نے دو ملکوں کو ہلا دیا۔ ایسی بے دھڑک آزادانہ اور رندانہ تقریر کبھی گول میز کانفرنس میں کاہے کو سنی گئی تھی محمد علی کی خطابت، ان کا پاکیزہ مذاق، زبان کی سلاست اور روانی، خیالات کا زور اور جوش اور سینے پر ٹکر کھاتے قومی جذبات کی بے باکانہ نمائندگی۔ یہ ایسی چیزیں تھیں کہ وہ تقریر ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ میں یادگار رہیگی جس وقت ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہوئی تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، مخالفوں کی مخالفت ہوا ہوگئی اور ان قومی اخباروں نے جو آج تک محمد علی کا مذاق اُڑا رہے تھے اسکی تعریف و توصیف میں کالم کے کالم رنگ ڈالے۔

اس تقریر کا ایک حصہ تو ایسا ہے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں سونے کے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انگریز اور ہندوستانی مندوبین کے اس بھرے مجمع میں آپ نے فرمایا:۔

"میں آپ سے درجہ مستعمرات لینے کے لئے نہیں آیا۔
میں مکمل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں۔
آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ
میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے
ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔
مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے
غربت کی موت منظور ہے۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی

آزادی نہیں دینگے۔ تو پھر آپ کو مجھے یہاں قبر کے لئے جگہ
دینی پڑے گی "

محمد علی قول کا دھنی تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ بیمار پہلے سے تھے۔ سفر کی صعوبت، ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود فرقہ وارانہ مفاہمت کے لئے دوڑ دھوپ اور اس تقریر کی تکان سے حالت اور خطرناک ہو گئی۔ ان الفاظ کے ادا کرنے کے چند ہی دن بعد یہ جواں مرد اور جواں ہمت انسان اس دارِ فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گیا۔

ایک جامع شخصیت

محمد علی جوہر کے بعد ہندوستان میں اور بہت سے ملک اور قوم کے فدائی اور قائد پیدا ہوں گے لیکن ایسی جامع شخصیت کا پیدا ہونا دشوار ہے جو ایک ہی وقت میں اسلام کا شیدا بھی ہو اور ملک کا عاشق بھی۔ شاعر بھی ہو اور نثار بھی، بذلہ سنج بھی ہو اور حق گو بھی، جس کا عزم اور استقلال پہاڑ سے ٹکر کھائے اور جس کی نرم اور شیریں گفتگو میں آبِ رواں کا لطف آئے جس کی دوستی خلوص کی تصویر اور دشمنی شرافت کا مرقع ہو، جس کی اصول پرستی مسلّم اور رواداری مشہور ہو۔

محمد علی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث خود ایک کتاب کی محتاج ہے اس لئے یہاں مختصراً ان کی چند ممتاز خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دلیری اور حق گوئی

موجودہ زمانے میں سیاست اسی کا نام ہے کہ سچی بات نہ کہی جائے۔ یا اگر کہی جائے تو اس طرح گول گول اور مبہم الفاظ میں کہ اس کا تمام اثر زائل ہو جائے۔ مگر محمد علی نے عمر بھر انتہا درجہ کی دلیری اور حق گوئی کا ثبوت دیا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے کہنے میں دوست اور دشمن، حاکم بادشاہ کسی سے نہ جھجکتے تھے۔ اکثر لیڈر ایسے مجمعوں سے بہت گھبراتے ہیں جہاں اکثریت

ان کی مخالف ہو۔ رائے عامّہ کے سیلاب کے ساتھ ساتھ بہنا آسان ہے اس کے دھارے پر چڑھنا مشکل۔ مگر محمد علی کبھی کسی مجمع سے نہیں دبے۔ ہندوستان کے عوام کا ہو یا انگلستان کے دارالعوام کا۔ مؤتمر اسلامی میں ابن سعود کو اسکے منھ پر ایسی کھری سُنائیں کہ لوگ ان کی بیباکی پر دنگ رہ گئے۔

ایک دفعہ وائسرائے کے پاس مسلمانوں کا ایک وفد لیکر گئے۔ لارڈ اروِن نے اِن کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ محمد علی نے اُسی وقت ان سے کہا کہ "اب ہماری آپ کی جنگ ہوگی صلح و سلام کا خاتمہ ہے"۔ اور جب وائسرائے نے کہا کہ "مجھے امید ہے آپ کی جنگ آئینی اور قانون کی حدود میں ہوگی" تو آپ نے فوراً جواب دیا:۔

"خدائی قانون کی اطاعت میرا اولین فرض ہے، اور اسی کی اطاعت میں کروں گا۔ اگر اس کی بجا آوری میں لارڈ اروِن کی حکومت کے قوانین مانع آتے ہیں تو مجھے ان کی پروا نہیں ہے"۔

اسلام کا سپاہی

محمد علی کی زندگی کے دورِ آخر میں ان پر مذہبیت کا رنگ بہت غالب تھا۔ اگرچہ انھوں نے انگریزی تعلیم پائی تھی لیکن طالب علمی کے بعد اپنے شوق سے اسلامی فلسفہ، فقہ اور ادب کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ اور جتنا زیادہ انھوں نے اپنے مذہب کا مطالعہ اور اس پر غور کیا اتنا ہی وہ اسلام کی سچائی اور عظمت کے قائل ہوتے گئے۔

اسلام اور مسلمانوں سے ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ تمام دنیا میں کسی جگہ مسلمانوں پر کوئی آفت یا مصیبت آئی اور وہ ان کی حمایت کو کھڑے ہو گئے۔

محمد علی ہمیشہ فخر سے کہتے تھے کہ میں اسلام کا سپاہی ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ حسن لیاقت اور جواں مردی سے وہ اسلام کی عظمت و شوکت، عزت و حرمت کے لئے لڑتے رہے۔ وہ اسلام کے ایک سچے سپاہی کی شان تھے۔

تحریک خلافت کا مقصد یہی تھا کہ اسلامی دنیا کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور اسلام کی عظمت و وقار کو صدمہ نہ پہنچے۔ اِس تحریک کو کامیاب بنانے میں انہوں نے کیا کچھ قربانیاں نہیں کیں۔ نظر بند رہے جیل گئے، مالی مشکلات برداشت کیں، چین اور آرام اپنے پر حرام کر لیا۔ مگر جب تک دم میں دم رہا اسلام کی خدمت سے مُنھ نہ موڑا۔

ملک بھر میں جہاں کوئی تحریک مسلمانوں کی بہبودی کے لیئے شروع ہوتی تھی وہ اس کی امداد میں دامے درمے سخنے کسی طرح دریغ نہ کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے لئے انہوں نے کیا کچھ کوششیں نہ کیں لیکن جب اِن کو یقین ہو گیا کہ اس کالج کا وجود مسلمانوں کے لئے مفید نہیں بلکہ مُضر ہے تو اسے چھوڑ کر جامعہ ملّیہ اسلامیہ قائم کی تاکہ مسلمان اصل معنوں میں آزاد قومی اور ملّی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور اس نئے ادارے کے استحکام اور ترقی کی وہ مرتے دم تک کوشش کرتے رہے۔

مسئلۂ حجاز میں جب تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ ابن سعود کی امارت اسلام کے لئے فائدہ مند ہوگی وہ اس کی حمایت میں کمربستہ رہے۔ گو انہیں اپنے دیرینہ دوستوں اور رفیقوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑی۔ لیکن جب حجاز جا کر ان کو یقین ہوگیا کہ ابن سعود اسلامی جمہوریت کے بجائے اپنی خاندانی بادشاہت قائم کر رہا ہے تو ان کو بھرے جلسے میں ابن سعود کی مخالفت کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوا۔

اسلام کے متعلق محمد علی کا جو نظریہ تھا وہ انہوں نے خود اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں بیان کیا تھا۔

"مذہب صرف عقیدے اور رسم کا نام نہیں ہے میرے نزدیک مذہب زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے۔ مجھے اسلام کے صدقے میں تہذیب، معاشرتی نظام اور زندگی کا اُمید افزا مستقبل حاصل ہے۔ اسلام ان تمام باتوں کا مکمل مجموعہ ہے۔ جہاں خدا کے حکم کا سوال ہو وہاں میں پہلے مسلمان ہوں اور آخر تک مسلمان رہوں گا ... ... میرا پہلا فرض یہ ہے کہ میں اپنے خدا کا حکم مانوں نہ کہ ملکِ معظم کا۔"

قوم پرست؟

ہندوستان کے موجودہ دور کے مورخ کو منجملہ اور سوالوں کے اِس سوال کا بھی جواب دینا ہوگا کہ آیا محمد علی حقیقی معنوں میں قوم پرست تھے یا نہیں۔ اور اگر وہ محض

غیر متعصبانہ نظر سے محمد علی کی سیرت کا مطالعہ کریگا۔ تو اسکو بھی یہی جواب دینا ہوگا کہ وہ قوم پرست ہوں یا نہ ہوں قوم پرور اور قومی خادم ضرور تھے۔ محمد علی "قوم پرستی" کے قائل نہ تھے یعنی وہ یورپ کے قوم پرستوں کی طرح قوم کو دیوتا بنا کر پوجنے کے خلاف تھے۔ طبیعتاً وہ بین الاقوامیت کے قائل تھے، اور جغرافی حدود کے پابند ہونے سے انکار کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ "قوم پرستی" کا جنون ترقی پانے پر کس طرح دنیا کے امن اور ترقی میں حایج ہوتا ہے۔ جنگیں "قوم پرستی" کے نام پر لڑی جاتی ہیں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کا خون اس دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ فطرتاً ایک مذہبی انسان واقع ہوئے تھے۔ اور وہ اس مذہب کے شیدائی تھے جو تمام عالم کو ایک نظر سے دیکھتا ہے جس میں جغرافی حدود اور سیاسی تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتیں، جو حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ محمد علی نے اپنے اس نظریہ کو اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا تھا:۔

"میں کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو۔ قوم پرستی انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے"۔

ایک اور موقع پر انہوں نے فرمایا "اسلام وطن پرور ہے، وطن پرست نہیں"۔

اور یہی حقیقت میں محمد علی کا مسلک تھا۔ باوجود قومیت کے تنگ نظریہ کے مخالف ہونے کے وہ اپنے وطن کی سچی محبت رکھتے تھے اور اس کی خدمت کو وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اس کی آزادی کے لئے وہ برابر کوشاں رہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو آپ کا کیا فرض ہوگا تو آپ نے فرمایا "میں ان کے خلاف صف آرا ہو کر ان کا مقابلہ کرونگا۔ اور اپنے عزیز وطن کو کسی غیر کا غلام نہ ہونے دونگا"۔

وطن سے اُن کی محبت آخر وقت تک قائم رہی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے انہوں نے کبھی کوشش اور قربانی سے دریغ نہ کیا۔ یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب ۱۹۲۷ء کی کانگریس میں پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنا "مکمل آزادی" کا ریزولیشن پاس کرانا چاہا تو یہ محمد علی ہی تھے جنہوں نے اس تجویز کی پُرزور موافقت کی تھی۔

اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلمانوں کی تنظیم میں مصروف رہے تھے اور لوگوں کا خیال ہو چلا تھا کہ محمد علی بھی اور فرقہ پرستوں کی طرح اب قوم پرور نہیں رہے۔ لیکن گول میز کانفرنس میں اپنی دلولہ انگیز تقریر سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ مرتے دم تک ان کا دل وطن پرستی کے جذبے سے معمور تھا۔

شاعر

بہت کم لوگ محمد علی کی شاعری سے واقف ہیں ان کی سیاسی اور قومی شخصیت اس قدر زبردست تھی کہ کسی کو خیال بھی نہ گزرتا تھا کہ یہ شخص جو ملک و قوم کی خدمت میں ان تھک کوششیں کرتا ہے یہ ایک شاعر کی نظر اور

شاعر کا دل بھی رکھتا ہے۔ فن کے نقطۂ نظر سے محمد علی اُردو شعراء کی صفِ اوّل میں جگہ نہیں پا سکتے۔ ممکن ہے کہ ان کی شاعری اور ترقی کرتی اگر وہ پورے انہماک سے اس میں دلچسپی لیتے۔ لیکن ان کا مستقل کام شاعری نہیں بلکہ قومی خدمت تھا کبھی کبھی خدمت میں شعر کہہ لیتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے شعروں میں ایک خاص درد اور سوز ہوتا تھا جو سننے والوں پر اثر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ محمد علی جوہر کے شعر ان کے دل کی آواز ہوتے تھے۔ بقول مولینا عبد الماجد صاحب دریابادی کے:۔

"جوہر کی شاعری ان کے قلب کی زبان، ان کے جذبات کی ترجمان اور ان کے واردات کا بیان ہے۔ آورد، تصنّع اور تکلف کا ان کے ہاں گزر نہیں۔"

مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابنِ علی کو — خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

گلہ اے دل بھی سے کرتا ہے — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
جان دیتا ہے عیشِ فانی پر — بس اسی زندگی پہ مرتا ہے
جس کو دنیا نے نامُراد کہا — وہی ناکام کام کرتا ہے

اخبار نویس

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محمد علی اخبار نویسی کے لئے بنائے گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے انگریزی اور اُردو اخبار نویسی میں وہ کامیابی حاصل کی جو ہندوستان میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ جس وقت "کامریڈ" نکلا تو کس کو امید تھی کہ تھوڑے ہی دن میں اس نوجوان صحافی کا پرچہ اس قدر مقبول عام ہو جائیگا۔ کہ وائسرائے سے لیکر قوم پرست رہنما تک سب اس کی اشاعت کے منتظر رہا کرینگے۔

اس زمانے سے اخبار نویسوں کی طرح محمد علی بھی بے حد زود نویس اور طول پسند واقع ہوئے تھے لیکن ان کا اندازِ بیاں اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ ان کے طویل مضامین کا پڑھنا گراں نہ گزرتا تھا۔ اور مزاحیہ نگاری کی تو گویا انہوں نے ہندوستان میں بنیاد ڈالی تھی۔ "گپ" کے کالم پڑھنے والوں کو اس پر لندن کے "پنچ" کا دھوکا ہوتا تھا۔

اُردو صحافت میں انہوں نے "ہمدرد" نکال کر ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ اس وقت تک اُردو روزناموں میں سوائے انگریزی اخبار کے غلط تراجم کے کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور یہ "ہمدرد" ہی تھا کہ اس نے ایسا اعلیٰ معیارِ صحافت قائم کیا۔ جو اکثر انگریزی اخباروں کو بھی نصیب نہ تھا۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" دونوں میں محمد علی نے چن چن کر قابل شریک کار رکھے جنہوں نے محمد علی کی نگرانی میں دونوں اخباروں کو مشہور و ممتاز بنا دیا۔ اگرچہ بعد میں سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے محمد علی صحافت کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی "ہمدرد" اور "کامریڈ" نے اپنے زمانے میں اتنی قابلِ قدر خدمات انجام دیں کہ ان کے نام ہندوستانی

صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ایک دلچسپ انسان

لیکن محمد علی فقط ایک دلیر قومی لیڈر، ایک قابل ادیب، اخبار نویس اور ایک عمدہ شاعر ہی نہیں تھے۔ ان سب خصوصیات سے بڑھکر ان کی بذلہ سنجی تھی۔ وہ ایک دلچسپ انسان تھے وہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنی ظرافت طبع اور شوخی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ حاضر جوابی میں کمال رکھتے تھے۔ حاضر جوابی بھی کیسی؟ پھکڑ اور فضول گوئی نہیں بلکہ نہایت ستھرا اور پاکیزہ مذاق۔

اگر محمد علی کی زندگی کے دلچسپ لطیفے جمع کئے جائیں تو اس سے زیادہ ضخامت کی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا دو دلچسپ لطائف پر اکتفا کی جاتی ہے۔

محمد علی ہمیشہ اسمبلی میں داخلہ کے خلاف رہے لیکن کبھی کبھی بحیثیت "ہمدرد" کے نمائندے کے پریس گیلری میں چلے جاتے تھے۔ ایک بار وہ اوپر بیٹھے تھے کہ نیچے سے ان کے ایک کانگریسی دوست نے مذاق میں کہا "محمد علی جب یہاں تک آ گئے ہو تو دو قدم اور اُتر کر ہمارے پاس ہی کیوں نہ آ جاؤ؟" محمد علی نے فوراً جواب دیا "جی نہیں میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا نظارہ دیکھ رہا ہوں"۔

"ہمدرد" کی ایک سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے دہلی کے مشہور شہریوں اور اخبار نویسوں کی ایک پر تکلف دعوت کی۔ مہمانوں کی طرف سے شکریہ کی تقریر حکیم اجمل خان مرحوم نے کی اور فرمایا "خدا کرے ایسی سالگرہ

ہر تیسرے مہینے ہوا کرے"! اس پر محمد علی نے برجستہ کہا "ضرور، مگر
اخبار کا چندہ
بھی اسی حساب
سے وصول
کیا
جائے گا

(جری عجلت رقم)